آزاد کشمیر کے منتخب غزل گو شعرا

(تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ)

مقالہ برائے ایم۔فل (اردو)

مقالہ نگار:

فرہاد احمد

Mughal\Desktop\Numal
Logo.gif not found.

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

ستمبر ۲۰۱۷ء

فرہاد احمد

آزاد کشمیر کے منتخب غزل گوشعرا

(تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ)

مقالہ نگار:

فرہاد احمد

یہ مقالہ

ایم۔فل (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگوئجز

(اردو زبان وادب)

نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

ستمبر ۲۰۱۷ء

فرہاد احمد

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انھوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: آزاد کشمیر کے منتخب غزل گو شعرا (تحقیقی و تجزیاتی جائزہ)

پیش کار: فرہاد احمد رجسٹریشن نمبر:985-mphil/urdu/f14

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: شعبہ زبان و ادب اردو

ڈاکٹر نعیم مظہر ______________________

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر محمد سفیر اعوان ______________________

ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

بریگیڈیئر محمد ابراہیم ______________________

ڈائریکٹر جنرل

____

تاریخ

اقرارنامہ

میں، مسمّٰی فرہاد احمد حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد کے ایم فل اُردو اسکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر نعیم مظہر کی نگرانی میں کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونی ورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ کروں گا۔

فرہاد احمد

مقالہ نگار

نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

ستمبر ۲۰۱۷ء

فہرست ابواب

مقالہ اور دفاع مقالہ کی منظوری کا فارم	iii
اقرار نامہ	iv
فہرست ابواب	v
مقالے کا دائرہ کار	ix
مقالے کا مقصد	x
Abstract	xi
اظہار تشکر	xii

باب اول: آزاد کشمیر میں اردو غزل کی روایت ۱۴

الف) غزل کی تعریف

ب) آزاد کشمیر میں اردو غزل کی روایت

عبدالغنی غنی، نذیر انجم، جاوید الحسن جاوید، عبدالعلیم صدیقی، اسلم راجا، مخلص وجدانی، لیاقت شعلان، علامہ جواد جعفری، ناز مظفر آبادی، زکریا شاز، سید شہباز گردیزی، احمد عطا اللہ، ایاز عباسی، الطاف عاطف، محمد خان نشتر، اکرم سہیل، شفیق راجا، احسن سلیمان، ظہیر احمد مغل، ڈاکٹر ماجد محمود، ظہور منہاس، آصف اسحاق، جاوید سحر، احمد وقار، اعجاز نعمانی، شوزیب کاشر، فاروق صابر

۔ حوالہ جات

باب دوم: آزاد کشمیر کے منتخب غزل گو شعرا (۱۹۷۰ تا ۲۰۰۰) ۵۸
۱۔ الطاف قریشی
- مختصر حالات زندگی
- فنی جائزہ
- فکری جائزہ
- اسلوبیاتی جائزہ
۲۔ زاہد کلیم
- مختصر حالات زندگی
- فنی خصوصیات:
- زاہد کلیم کی شعری فکر
- اسلوبیاتی جائزہ
۳۔ ڈاکٹر صابر آفاقی
- مختصر حالات زندگی
- فنی جائزہ
- فکری جائزہ
- اسلوبیاتی جائزہ:
- حوالہ جات

باب سوم: آزاد کشمیر کے منتخب غزل گو شعرا (۲۰۰۰ تا حال) ۱۲۸
۱۔ سیدہ آمنہ بہار
- مختصر حالات زندگی
- فنی جائزہ:

۔ فکری جائزہ
۔ اسلوبیاتی جائزہ:
۲۔ افتخار مغل
۔ مختصر حالات زندگی
۔ فکری جائزہ:
۔ فنی جائزہ:
۔ اسلوبیاتی جائزہ
۳۔ واحد اعجاز میر
۔ مختصر حالات زندگی
۔ فنی جائزہ:
۔ فکری جائزہ:
۔ اسلوبیانی جائزہ:
۔ حوالہ جات
باب چہارم: آزاد کشمیر کے شعرا کی غزل کا باہم تقابل ۲۰۴
۱۔ اشتراکات فکری اعتبار سے
۔ آزادی کشمیر
۔ عشق و محبت
۔ فنی اعتبار سے اشتراکیت
۔ منظر نگاری
۔ صنائع بدائع کا استعمال
۔ حوالہ جات

باب پنجم: مجموعی جائزہ، نتائج، تجاویز وسفارشات   ۲۱۶

ا)   مجموعی جائزہ

ب)   نتائج

ج)   سفارشات

-    حوالہ جات

-    کتابیات

مقالے کا دائرہ کار

آزاد کشمیر کی ریاست جہاں دیگر کئی حوالوں سے دنیا میں اپنی پہچان رکھتی ہے وہیں سر زمین کشمیر کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ یہاں کے ادیب و شاعر کسی طور بھی اُردو دنیا کے بڑے ناموں سے کم نہیں۔ اُردو غزل کے حوالے سے آزاد کشمیر کے شعرا کو کسی بھی اعتبار سے پرکھیں تو وہ اس باب میں خوش نما اضافے کا باعث ہے۔ اُردو ادب کو ثروت مند بنانے کے لیے آزاد کشمیر کے شعرا نے گراں قدر خدمات پیش کیں لیکن میں نے اپنے موضوع کی مناسبت سے صرف چھے شعرا کو مقالے میں شامل کیا ہے۔ ڈاکٹر صابرؔ آفاقی، زاہدؔ کلیم، الطافؔ قریشی، ڈاکٹر افتخارؔ مغل، سیدہ آمنہؔ بہار اور واحدؔ اعجاز میر یہاں کے وہ منتخب شعرا ہیں جن کو میں نے اپنے مقالے کا حصہ بنایا ہے۔ مجوزہ مقالے میں مذکورہ شعرا کے کلام کو فنی فکری اور اسلوبیاتی سطح پر پرکھا گیا ہے۔ مقالہ پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

مقالے کے پہلے باب میں آزاد کشمیر کے شعری منظر نامے کا مختصراً جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ جس میں آزاد کشمیر کے شعرا کے کلام کے نمونے کے ساتھ ان کے کلام کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ آزاد کشمیر کی شعری روایت پر مبنی باب ہے جس میں آزاد کشمیر کے مختلف شعرا کے ادبی کام کا احاطہ کیا گیا ہے۔

دوسرے باب میں آزاد کشمیر کے ۱۹۷۰ء سے ۲۰۰۰ء تک کے منتخب شعرا کے کلام کا جائزہ ان کے مختصراً حالات زندگی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ یہ منتخب شعرا الطافؔ قریشی، زاہدؔ کلیم اور ڈاکٹر صابرؔ آفاقی ہیں۔

زیر تحقیق مقالے کے تیسرے باب میں ۲۰۰۰ء سے ۲۰۱۶ء تک کے شعرا کے کلام کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس عرصے کے منتخب شعرا میں سیدہ آمنہؔ بہار، ڈاکٹر افتخارؔ مغل اور واحدؔ اعجاز میر ہیں جن کی غزل کا فنی ،فکری اور اسلوبیاتی جائزہ اس باب کا حصہ ہے۔

باب چہارم میں آزاد کشمیر کے منتخب غزل گو شعرا کے باہم تقابل پر مشتمل ہے جس میں ان شعرا کے مابین اشتراکیت کو واضح کیا گیا ہے۔ یہ اشتراکیت فکری سطح پر بھی فنی اور اسلوبیاتی سطح پر بھی سامنے لائی گئی ہے۔

پانچواں باب مجموعی جائزے، نتائج و سفارشات پر مشتمل ہے۔ جس میں گزشتہ ابواب کی بحث کا اجمالی جائزہ لے کر سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے اس کے بعد نتائج بیان کیے گئے ہیں۔ جب کہ آخر میں چند سفارشات بھی مرتب کی گئی ہیں۔

مقالے کا مقصد

ادیب معاشرے کا حساس فرد ہوتا ہے۔لوگوں کو درپیش سائل ادیب کے قلم سے جلا پاتے ہیں اور ادیب اُن مسائل کو اجاگر کرنے میں معاون و مددگار رہوا ہے۔ابتدا سے لے کر لمحۂ موجود تک اگر تحریروں پر غور کیا جائے تو ادیب کہیں بھی اپنا ذاتی مفاد حاصل کرتا نظر نہیں آتا۔وہ بے زبان معاشرے کو گویائی دیتا ہے۔لوگوں کے احساسات وجذبات کو اپنی شاعری یا نثر کی صورت میں اہلِ اقتدار تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔

آزاد کشمیر کے ادبی منظرنامے میں ایسے بیسیوں شعرا موجود ہیں جو اپنے مخصوص طرزِ تحریر اور جداگانہ فکر کی بدولت ادبی دُنیا میں اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ یہ شعرا اپنی شاعری میں معاشرے کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔آزاد کشمیر کے شعرا میں سے منتخب شعرا کے کلام کو فنی وفکری اور اسلوبیاتی سطح پر پرکھنا اِس مقالے کا مقصد ہے۔مقالے کے اندر اِن شعرا کے کلام میں محاسن کو مثالوں سے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مجوزہ تحقیق میں اِن شعرا کے کلام کا جائزہ لیا گیا ہے جس میں اُن کے ماحول اور معاشرے کے ساتھ ساتھ کشمیر کا تناظر بھی موجود ہے۔اِن شعرا کے ہاں اپنے ماحول کا اثر کس حد تک موجود ہے؟ اِن کی زبان اور ماحول کس قدر کارفرما ہے؟ اِن تمام باتوں کو مدنظر رکھ کر تحقیق کرنا مقالے کے مقاصد میں شامل ہے تا کہ بہتر نتائج اخذ کیے جاسکیں۔

ABSTRACT

Selected Poets (Ghazal Go) of Azad Kashmir analysis and research.

The state of Azad Jammu & Kashmir hast its unique recognition in various aspects of literature. Many literature figures have conducted their research in different genre of literature. The researchers and poets have their have their marvelous place in the world of literature. If you try to know the poets and researches of this land, you will find them worthwhile. The literary figures of Azad Kashmir have contributed a lot to make Urdu literature rich. These are the selected literary figures Dr. Sabir Afaqi, Zahid Kaleem, Altaf Qureshi, Dr. Iftikhar Mughal, Syeda Amina Bahr and Wahid Ejaz Mir are renowned poets who have been chosen for this. The suggested thesis contains the following selected poet analysis of their thought, art and style basis. Thesis has been divided in to five chapters.

Chapter 1: In the first chapter of thesis, there is short analysis and background of poetry in Azad Kashmir.

Chapter 2: The analysis of poetry of selected poets from 1970 to 2000 in Azad Kashmir. These selected poets are Altaf Qureshi, Zahid Kaleem and Dr. Sabir Afaqi.

Chapter 3: The third chapter of thesis has been consisted of selected poets of Azad Kashmir from 2000 to 2016. These selected poets are Syeda Amina Bahr, Dr. Iftikhar Mughal and Wahid Ejaz Mir.

Chapter 4: In the fourth chapter, comparative study has been presented among these selected poet of Azad Kashmir.

Chapter 5: This chapter is based on a comprehensive study, conclusion and recommendations deduced as a result of the overview of the discussion in the first four chapters, reaching a summarize and compiling a few suggestions at the end.

اظہارِ تشکر

میں شکر گزار ہوں اللہ رب العزت کا جس نے مجھے اپنے خاص فضل سے نوازا اور میں مقالہ لکھنے کے قابل ہوا۔ بلاشبہ انسان بہت ضعیف اور کم زور ہے وہ اللہ کی رضا و منشا اور اس کے کرم کے بغیر کوئی بھی سفر مکمل نہیں کر سکتا۔ اس کے ساتھ ساتھ کچھ ایسے وسائل بھی ہوتے ہیں جو کسی بھی مسافر کے لیے باعثِ رہنمائی ہوتے ہیں۔ میرے اس سفر میں کئی ایسے لوگ موجود رہے جن کا ساتھ اگر حاصل نہ ہوتا تو میرا اس سطح پر پہنچنا تو کجا پہنچنے کا سوچنا بھی محال تھا۔ میرے والد ماجد عبدالغنی اعوان اور والدہ ماجدہ پروین اختر نے میرے لیے جو کچھ کیا اس کا بدلہ چکانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔

میرے لیے نہایت قابلِ احترام اَساتذہ کا بھی شکریہ جن سے میں نے لفظوں کی حرمت سیکھی۔ میں شکر گزار ہوں صدر شعبۂ اردو پروفیسر ڈاکٹر روبینہ شہناز کا جن کی شفقت کبھی کم نہ ہوئی۔ میرے انتہائی شفیق اور محترم استاد ڈاکٹر نعیم مظہر کا شکریہ جنھوں نے قدم قدم پر مجھے حوصلہ بخشا اور رہنمائی کی ان کی توجہ کے بغیر شاید یہ کام مکمل نہ ہو پاتا۔ میرے دیگر محترم اساتذہ ڈاکٹر عابد سیال، ڈاکٹر فوزیہ اسلم، ڈاکٹر شفیق انجم، ڈاکٹر صائمہ نذیر، ڈاکٹر بشریٰ پروین ، ڈاکٹر عنبرین شاکر، ڈاکٹر رخشندہ مراد، ڈاکٹر نازیہ ملک میں آپ سب کا بھی سپاس گزار ہوں کہ آپ نے مجھے بہت کچھ سکھایا۔

علاوہ ازیں میرے محسن ، دوست اور استاد نذیر حسین اعوان کا شکریہ جنھوں نے مجھے انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا۔ میرے محسن شوکت اقبال مصور کا شکریہ جنھوں نے مجھے تحریک بخشی۔ میرے دوست حسن ظہیر راجا، ظہیر عمر، پروفیسر احمد وقار، پروفیسر آصف اسحاق کا شکریہ جن کی نیک خواہشات میرا سرمایہ ثابت ہوئیں۔ ڈاکٹر ماجد محمود ماجد، ساجد عباس، عبدالمنان وانی، یوسف میر اور نگہت نورین آپ کا شکریہ ادا نہ کرنا زیادتی ہوگی۔ میری شریکِ حیات سائرہ ارشاد قریشی نے میرے اس سفر میں میرا ساتھ دیا اور معاونت سے کبھی اکتاہٹ کا اظہار نہ کیا جس کے لیے ان کا شکر گزار ہوں۔ میرے خطِ شکستہ کو کمال محبت سے کمپوزنگ کرنے پر اپنے دوست سہیل مقصود مغل کا شکریہ ادا کرنا واجب ہے۔

دورانِ تحقیق میرے بہن بھائیوں اور دیگر جن دوستوں نے کسی بھی حوالے سے میری معاونت کی اس کے لیے میرے دل سے ان کے لیے دعا نکلتی ہے۔ جملہ تمام احباب کے لیے دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کے لیے ہر قدم آسانیاں پیدا کرے اور دو جہاں کی خوشیاں عطا فرمائے۔ (آمین)

فرہاد احمد فگاؔر

۲۴، ستمبر، ۲۰۱۷ء

باب اول

آزاد کشمیر میں اردو غزل کی روایت

غزل کی تعریف:

غزل اردو ادب کی سب سے مقبول صنفِ سخن ہے۔اردو کے قریب قریب سبھی شعرا نے اس صنف پر طبع آزمائی کی ہے۔لیکن اس صنف نے تمام شعرا کو قبول نہ کر کے اپنی سنگ دلی کا ثبوت دیا۔اگر ہم لغوی اعتبار سے غزل کو دیکھیں تو شان الحق حقی کے مطابق غزل پیار محبت کے بول، اظہار، محبت، عاشقانہ گفتگو، عشقیہ کلام ہے۔نظم کی ایک صنف جو ایک ہی زمین میں متفرق اشعار پر مشتمل ہوتی ہے جس میں معنوی ربط ضروری نہیں۔علمی اُردو لغت کے مولف وارث سرہندی غزل کے معنی یوں بتاتے ہیں:

> ''عورتوں سے باتیں کرنا، عورتوں کے حسن و جمال کی تعریف کرنا، نظم کی ایک صنف جس میں عشق و محبت کا ذکر ہوتا ہے، پہلا شعر مطلع اور آخری مقطع کہلاتا ہے۔'' ۱

مصباح اللغات کے بہ موجب غزل کی تعریف کچھ اس طرح سے ہے:

> ''غزل کے لغوی معنی عورتوں یا عورتوں کے متعلق گفتگو کرنا ہیں۔ ہرن کے منہ سے بہ وقت خوف جو دردناک چیخ نکلتی ہے اسے بھی غزل کہتے ہیں ۔اس نسبت سے غزل وہ صنف شعر ہے جس میں حسن و عشق کی مختلف کیفیات کا بیان ہو اور اس میں دردو سوز بہت نمایاں ہو۔اصطلاحاً غزل کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں جن کا مفہوم یہ ہے کہ غزل کے ہر شعر میں ایک مکمل مفہوم ادا ہوتا ہے۔ ہر شعر اپنا اپنا الگ مفہوم دیتا ہے۔'' ۲

حامد حسن قادری غزل کی تعریف اِن الفاظ میں کرتے ہیں:

''غزل کے معنی ہیں عشق و جوانی کا ذکر کرنا شاعری میں غزل اُس نظم کو کہتے ہیں جس میں حُسن و عشق، اَخلاق و تصوف وغیرہ مختلف مضامین ہوں اور ہر شعر الگ مضمون کا ہو۔''۳

درجہ بالا تعریفوں کی روشنی میں جب ہم غزل کو دیکھتے ہیں تو واضح ہو جاتا ہے کہ ایسی نظم جس میں عورتوں سے متعلق بیان ہو اور عشق کی باتیں ہوں غزل کہلائے گی۔ غزل کی یہ تعریف کافی نہیں معلوم ہوتی ہے۔ موجودہ دور میں غزل اس تعریف سے کہیں آگے دکھائی دیتی ہے۔ آج کی غزل میں ہر طرح کے موضوعات ملتے ہیں۔ معاشرتی، معاشی، سیاسی ہر اعتبار سے غزل کے اشعار موجود ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کی وسعت میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ لغات کے بعد اب ذرا اصناف ادب میں غزل کی تعریف کو دیکھتے ہیں۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی لکھتے ہیں:

''غزل کے لغوی معنی عورتوں یا عورتوں کے متعلق گفتگو کرنا ہیں۔ ہرن کے منہ سے بہ وقت خوف جو دردناک چیخ نکلتی ہے اسے بھی غزل کہتے ہیں۔ اسی نسبت سے غزل وہ صنف شعر ہے جس میں حسن و عشق کی مختلف کیفیات کا بیان ہو اور اُس میں درد و سوز بہت نمایاں ہو۔ اصطلاحاً غزل کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں جن کا مفہوم یہ ہے کہ غزل کے ہر شعر میں ایک مکمل مفہوم ادا ہوتا ہے۔ ہر شعر اپنا اپنا الگ مفہوم دیتا ہے۔''۴

غزل کی اس تعریف کی روشنی میں پتا چلتا ہے کہ غزل ایک ایسی صنف نظم ہے جس میں بحر ایک ہی رکھی جاتی ہے۔ اس میں عموماً قافیہ اور ردیف موجود ہوتا ہے لیکن غیر مردف غزلیں بھی شعرا کے ہاں ملتی ہیں۔ مطلع ایک سے زیادہ بھی ہو سکتے ہے۔ مقطع کے بغیر بھی غزلیں کہی جا سکتی ہے۔ ابتدا سے لے کر تا حال غزل کے اندر تغیر و تبدل نظر آتا ہے لیکن اس کا بنیادی ڈھانچہ وہی ہے جو ہمیں ولؔی، میرؔ، سوداؔ، ذوقؔ، غالبؔ اور داغؔ وغیرہ کے ہاں نظر آتا ہے۔ ہر اس علاقے میں جہاں اُردو ادب نے نمو پائی وہاں غزل کہنے والے موجود رہے۔ خطۂ کشمیر میں اُردو ادب کی ابتدا کا جائزہ لیا جائے تو یہاں بھی روزِ اول سے اس صنف میں طبع آزمائی کی گئی بالخصوص آزاد کشمیر میں اُردو غزل نے جو ترقی حاصل کی وہ یقینی طور پر اُردو ادب کے خزانے میں بیش بہا اضافہ ہے۔

آزاد کشمیر میں اُردو غزل کی روایت

آزاد کشمیر میں اُردو غزل کی روایت بیان کرنے سے پہلے ہم دیکھتے ہیں کہ اس خطے میں اُردو زبان وادب کا آغاز کب ہوا؟ اُردو زبان جب دکن اور گجرات میں پھل پھول رہی تھی تو اسی دوران میں شیخ غلام محی الدین نے مثنوی گلزار فقر رقم کر کے یہاں ادب کا بیج ڈالا، حافظ محمود شیرانی کے مطابق:

> ''گجرات و دکن میں اگرچہ اُردو تالیفات دسویں صدی ہجری سے شروع ہو جاتی ہیں ۔لیکن شمالی ہندوستان میں دو صدی بعد تک ان کا پتا نہیں ملتا۔ دہلی میں ابھی اُردو دبستان قائم نہیں ہو چکتا کہ پنجاب میں لوگ اُردو زبان میں مثنوی لکھنی شروع کر دیتے ہیں ۔ میر پور (کشمیر) کے شیخ غلام محی الدین مثنوی گلزار فقر ۱۱۳۱ہجری میں ختم کر دیتے ہیں ۔'' ۵

میر پور آزاد کشمیر کا ایک بڑا علمی وادبی مرکز ہے۔اس خِطے سے اُردو شاعری کا آغاز گلزار فقر (۱۷۱۷ء) کی صورت میں ہونا اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اس خطے سے اُردو کی شمع روشن ہوئی۔کشمیر میں اُردو زبان کے حوالے سے پریم ناتھ بزاز لکھتے ہیں کہ ۳۰، ۲۹ستمبر۱۹۴۴ءکو نیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس سوپور میں منعقد کیا گیا جس میں تمام شرکا اور مندوبین نے اردو اور کشمیری کو نیشنل کانفرنس کا آئندہ نصب العین قرار دیتے ہوئے متفقہ طور پر منظور کرلیا کہ:

> ''ریاست کی قومی زبانیں کشمیری،ڈوگری،بلتی (پالی) دری، پنجابی، ہندی اور اُردو ہوں گی۔اُردو کو ساری ریاست کی مرکزی قومی زبان کی حیثیت حاصل ہوگی۔'' ۶

اس اقتباس کی روشنی میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ مہاراجا کشمیر نے تقسیم سے قبل ہی یہاں اُردو کو مرکزی زبان کا درجہ دے دیا۔اب اس تناظر میں بھی یہاں اُردو ادب کی ترویج وترقی اچنبھے کی بات نہیں ۔ خطے میں اُردو کی ترقی وترویج کی تاریخ دیکھیں تو پتا چلتا ہے کہ ہندوستان اور پنجاب کے مختلف علاقوں سے جب لوگ یہاں ملازمت وسیاحت کی غرض سے آنے لگے تو وہ اپنے ساتھ وہاں سے اُردو زبان بھی لائے مقامی زبانوں کے میل ملاپ نے اُردو کو یہاں مزید ثروت مند بنا دیا۔مواصلات میں بہتری آئی اور اُردو ادب کے فروغ میں یہ چیز نہایت مفید ثابت ہوئی۔اس

حوالے سے کشمیر میں اُردو کے مصنف حبیب کیفوی لکھتے ہیں:

''ریاست کو پڑھے لکھے لوگوں اور ہنرمندوں کی ضرورت محسوس ہوئی تو ہندوستان اور پنجاب سے لوگ کشمیر میں آنے لگے۔حکومت نے اپنے مفاد کے لیے ان لوگوں کو ملازمتیں دیں اور اچھے اچھے عہدوں پر فائز کیا۔ یہ لوگ اپنی زبان اُردو بھی ساتھ لائے اور مقامی لوگوں کے میل ملاپ سے کشمیر میں اُردو کی سبیل نکل آئی۔''[۷]

آزاد کشمیر میں اُردو کے حوالے سے یہ اقدامات آج بھی دیکھنے میں آتے ہیں کہ پاکستان کے مختلف شہروں سے لوگ روزگار اور سیاحت کی غرَض سے یہاں آتے ہیں تو مقامی زبان کی بہ جائے اُردو ہی کو رابطے کی زبان بناتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ریاست جموں وکشمیر کے ہر گھر اور ہر اِدارے کے ساتھ ساتھ کوچہ و بازار میں بھی اُردو ہی نظر آتی ہے۔اُردو یہاں کی مقامی بولیوں پر اس قدر غالب آچکی ہے کہ نوجوان نسل اُردو تو بہ خوبی جانتی ہے لیکن علاقائی بولیوں کو بھولتی چلی جارہی ہے۔ایسے ماحول میں اُردو ادب نے خوب ترقی کی اور بالخصوص اُردو غزل نے جو ترقی کی راہیں طے کیں وہ قبل اس کے نہیں کرسکی۔

یوں تو تمام آزاد کشمیر میں اُردو زبان و ادب نے نمو پائی اور ہر طرح کا ادب تخلیق ہوا۔لیکن ادب کی ترقی و ترویج میں دو بڑے مراکز مظفرآباد اور میر پور کہلائے۔مظفرآباد آزاد کشمیر کا دارالحکومت ہونے کی وجہ سے ایک بڑا ادبی مرکز کہلاتا ہے۔اس علاقے میں اُردو کے نام ور ادبا اور شعرا نے جنم لیا جو نہ صرف ملکی بل کہ بین الاقوامی سطح پر بھی اُردو کے حوالے سے اہم مقام رکھتے ہیں۔مظفرآباد، سری نگر اور اسلام آباد سے قریب ہونے کی وجہ سے بھی یہاں ادبا آتے رہے۔ بہ سلسلۂ ملازمت بھی آزاد کشمیر کے دوافتادہ دیہات اور چھوٹے اضلاع کے لوگوں نے یہاں کا رُخ کیا جس کے باعث مظفرآباد نے باقاعدہ ایک دبستان کی سی حیثیت اختیار کرلی۔ یہاں نظم، غزل، مرثیہ، رباعی، افسانہ، ڈراما اور دیگر اصناف ادب میں طبع آزمائی کرنے والے کئی لوگ اعلیٰ ادبی مقام کے حامل ہیں۔ڈاکٹر صابرؔ آفاقی، ڈاکٹر افتخارؔ مغل، الطافؔ قریشی، زاہدؔ کلیم، آزرؔ عسکری، محمد خان نشترؔ، سیدہ آمنہؔ بہار، مخلص وجدانیؔ، ڈاکٹر ندیمؔ بخاری، احمد عطاؔ اللہ، اعجازؔ نعمانی، ایم یامینؔ اور واحدؔ اعجاز میر سمیت بے شمار لکھنے والوں نے اسی ضلع کی نمائندگی کی۔

ضلع میر پور میں اگر دیکھیں تو وہاں مظفر آباد کی نسبت ادبی ماحول مدہم ہے لیکن میر پور چوں کہ ایک بڑا شہر ہے پنجاب کے اہم شہروں جہلم اور گجرات سے قریب تر ہے۔ جہلم اور گجرات کے اکثر شعرا اورادیب بھی میر پور کے دبستان سے متعارف ہوئے۔ میر پور میں ادبی سرگرمیاں بھی بڑھ چڑھ کر ہوتی رہیں جو تا حال جاری ہیں یہاں کے اہم لکھنے والوں میں پروفیسر رفیقؔ بھٹی، پروفیسر صغیرؔ آسی، نصیرؔ احمد ناصر، احمد شمیمؔ، زیدؔ اللہ فہیم، پروفیسر نذیرؔ انجم، مشتاقؔ شاد، اکرمؔ طاہر، ذوالفقار علی اسدؔ اور عابد محمود عابدؔ وغیرہ چند نام ہیں اس کے علاوہ نئے لکھنے والوں کی بھی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔

ان دو اضلاع کے علاوہ اب دیگر چھوٹے اضلاع میں بھی اُردو غزل کہنے والے بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ پروفیسر عبدالعلیمؔ صدیقی جو اہل زبان ہونے کے ساتھ ساتھ علم عروض پر بھی دسترس رکھتے تھے۔ آپ نے آزاد کشمیر کے ضلع سدھنوتی کے شہر پلندری میں اپنے قیام کے دوران میں علامہ اقبالؔ کے فارسی کلام کا منظوم اُردو ترجمہ کر کے جہاں ایک بڑا کام کیا وہیں آپ نے اس علاقے کے نوجوانوں کے لیے اپنی خدمات وقف کر دیں۔ عبدالعلیمؔ صدیقی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ آج اس علاقے میں باقاعدہ ادبی نشست ہر پندرہ دن بعد منعقد ہوتی ہے۔ اس علاقے میں باقاعدگی سے مشاعرے بھی انعقاد پذیر ہو رہے ہیں جن میں پاکستان اور آزاد کشمیر بھر سے شعرا حضرات مدعو کیے جاتے ہیں۔ پلندری کے شعرا میں ڈاکٹر ماجد محمود ماجدؔ ایک اہم نام ہے جنھوں نے حقیقی معنوں میں پروفیسر عبدالعلیمؔ صدیقی کا جانشین ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ ڈاکٹر ماجدؔ علم عروض پر دسترس رکھنے کے ساتھ ساتھ فنِ شعر سے بھی آشنا ہیں۔ علاوہ ازیں جمیل اختر جمیلؔ، آصفؔ اسحاق، ضیا الرحمٰن ضیاؔ، جاوید الحسن جاویدؔ اور صداقت طاہرؔ اس ضلع کے اہم غزل گو ہیں۔

آزاد کشمیر کے ضلع باغ میں بھی علم وادب کی محافل باقاعدہ انعقاد پذیر ہوتی ہیں۔ باغ میں بھی غزل کے حوالے سے کئی اہم نام دکھائی دیتے ہیں جو اُردو غزل میں اپنا لوہا منوا چکے ہیں۔ اسلم راجا، پروفیسر شفیق راجا، زبیر حسن زبیریؔ، سید شہبازؔ گردیزی، احمد فرہادؔ، عبدالحق مرادؔ، سید علی شاہ باغ کے معروف شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔

اس کے علاوہ دیگر اضلاع میں اگر اُردو غزل کہنے والوں کی تعداد دیکھی جائے تو بہت کم ہے عباس پور سے جاوید سحرؔ، راولاکوٹ سے لیاقتؔ شعلان، شوزیبؔ کاشر، فاروق صابرؔ اور ڈاکٹر کبیر خان وغیرہ اہم لکھنے والوں میں

شامل ہیں۔ ضلع نیلم سے احمد وقارؔ، عبدالبصیر تاجورؔ اور لطیفؔ آفاقی نے غزل گوئی میں نام کمایا ہے۔

آزاد کشمیر کی غزل میں جہاں جدت دکھائی دیتی ہے وہیں یہ روایت کی پاس دار اور امین بھی ہے۔ یہاں کے شعرا کے ہاں موضوعاتی اور اسلوبیاتی سطح پر کئی طرح کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ آزاد کشمیر میں اُردو غزل کی روایت کو جانچتے ہوئے ذیل میں چند شعرا کا تعارف اور ان کے کلام کی خصوصیات کا جائزہ لیا جائے گا جس سے یہاں اُردو غزل کی روایت کو سمجھنے میں آسانی رہے گی۔

آزاد کشمیر کے غزل گو شعرا:

آزرؔ عسکری (اپریل ۱۹۱۴ء تا ۶ مارچ ۱۹۸۳ء) سکردو، گلگت بلتستان میں پیدا ہوئے آپ قادرالکلام شاعر تھے۔ آزرؔ عسکری ابتدائی تعلیم سکردو اور بعد ازاں سری نگر سے حاصل کرنے کے بعد فارسی اور اُردو میں فاضل کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۳۲ء میں شاعری کا آغاز کیا پروفیسر صغیرؔ آسی کے مطابق:

> ''آپ نے اُردو شاعری کی ابتدا ۱۹۳۲ء میں کی اور کلام کی اصلاح ابوالاثر ،حفیظؔ جالندھری سے لیتے رہے۔''۸

آزرؔ عسکری نے اُردو کے علاوہ پنجابی، کشمیری اور فارسی میں شاعری کی۔ آپ غزل کے ساتھ ساتھ نظم کے بھی شاعر تھے۔ آزرؔ عسکری کا بیشتر کلام مزاح پر مبنی ہے۔ " کشت زعفران" کے نام سے ۱۹۷۶ء میں شعری مجموعہ منظر عام پر آیا۔ مظفر آباد میں وفات پانے والے آزرؔ عسکری کے بیٹے ابراہیمؔ گل بھی پر تاثیر شاعر ہیں۔ آزرؔ عسکری کے کلام سے بہ طور نمونہ چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

دیے جس نے دستِ دعا اور دے گا
تجھے جس نے اب تک دیا اور دے گا
نہ کر غم تو امروز وفردا کا آزرؔ
خدا اور دے گا خدا اور دے گا ۹

ڈھونڈتے پھرتے ہیں پروانے ضیائے شمع کو

شمع کو بھی یورشِ پروانہ سے فرصت نہیں ۱۰

عبدالغنی غنیؔ (۱۸ جون ۱۹۱۴ء) آزاد کشمیر کے معروف شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ضلع پونچھ میں آنکھ کھولنے والے عبدالغنی نے ابتدائی تعلیم پونچھ کے اسلامیہ ہائی اسکول میں حاصل کی۔نویں جماعت میں شعر کہنا شروع کیا۔ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔میٹرک کے بعد حکومتِ آزاد جموں وکشمیر میں ملازمت اختیار کی اور ساتھ ہی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا 1۹۵۵ء میں پنجاب یونی ورسٹی سے بی ۔اے پاس کرنے کے بعد ۱۹۵۷ء میں اسی ادارے سے صحافت کا ڈپلوما حاصل کرلیا۔جگرؔ مرادآبادی اور فیض احمد فیضؔ کے ساتھ مشاعرے پڑھنے کا اعزاز بھی حاصل رہا۔ مظفرآباد میں حلقہ اربابِ ذوق قائم کروانے میں پیش پیش رہے۔آزاد کشمیر میں اُردو زبان وادب کی ترقی کے حوالے سے آپ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔۱۹۶۳ء میں عبدالغنی غنیؔ کو انجمن ترقیٔ اُردو کا صدر منتخب کرلیا گیا۔اس پلیٹ فارم سے علمی وادبی سرگرمیاں باقاعدگی سے انعقاد پذیر کروانے کے علاوہ آپ نے ۱۹۴۴ء میں آزاد کشمیر میں اُردو کو سرکاری زبان کا درجہ دلانے میں اہم کردار ادا کیا۔آپ کی دعوت پر ڈاکٹر سید عبداللہ،مولانا ماہرالقادری، آغا شورش کاشمیری، استاد قمر جلالوی جیسی نابغہ روزگار شخصیات نے آزاد کشمیر میں قدم رکھا۔"ذار ذار"اور" فکر وفن" کے نام سے شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔عبدالغنی غنیؔ کے کلام سے چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہوں۔

نہ پوچھ اس بت توبہ شکن کے کیا ارادے ہیں
یہ دیکھو عاشقِ دار و رسن کے کیا اردے ہیں ۱۱

یہ فصلِ گل، یہ چاندنی راتیں، یہ بے کسی
اب نغمۂ فراق نہ گاؤں تو کیا کروں ۱۲

غنیؔ سرمستیاں اپنی گزری ہیں گراں ان کو
وہ کیا جانیں مرے دیوانے پن کے کیا ارادے ہیں ۱۳

جب کوئی لطفِ زندگی نہ رہا
زندگی بسر ہوئی نہ ہوئی ۱۴

آپ بالائے بام آ جائیں
ہم کو تابِ نظر ہوئی نہ ہوئی ۱۵

پروفیسر نذیر انجم (۱جنوری ۱۹۴۶ء تا ۲۰۱۲ء) کا شمار بھی آزاد کشمیر کے نمائندہ شعرا کی فہرست میں ہوتا ہے۔ میرپور کے قصبے اکال گڑھ میں آنکھ کھولی۔ ابتدائی تعلیم اسی قصبے سے حاصل کرنے کے بعد انٹرمیڈیٹ اور بی اے گورنمنٹ کالج میرپور سے کیا۔ جامعۂ پنجاب، لاہور سے سیاسیات میں ماسٹر ڈگری حاصل کی۔ عملی زندگی کا آغاز بحیثیت لیکچرار کیا۔ کئی کالجز میں فرائض منصبی سرانجام دینے کے بعد آزاد جموں وکشمیر یونی ورسٹی تک پہنچے جہاں سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ آزاد کشمیر میں شعری ادب کے حوالے سے نذؔیر انجم کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ آپ نمود و نمائش کے قائل نہیں گوشہ نشینی کی زندگی کو پسند کرتے ہیں۔ پروفیسر صغیر آسؔی لکھتے ہیں:

> ''طبیعت میں سادگی، مزاج میں بے تکلفی اور کردار میں بے باکی، جسمانی اعتبار سے دبلے مگر فکری لحاظ سے عمومی سطح سے بلند اور عمیق تر، ارادے میں چٹان کی طرح پختہ اور قول و فعل میں یک رنگ، بہت کم شاعروں میں ایسی خوبیاں یک جا ملتی ہیں۔'' ۱۶

رانا غلام سرور سے مقالہ نگار نے جب پروفیسر نذؔیر انجم کے بارے میں بات کی تو انھوں نے یوں اپنے تاثرات بیان کیے:

''نذیر انجم یک زندہ دل شخصیت کے مالک تھے ۔نہایت اعلیٰ ادبی ذوق رکھتے تھے۔صبح سویرے گھر سے نکل آتے اور اپنے چاہنے والوں سے مل کر خوشی محسوس کرتے ۔میر پور کے چوک شہیداں میں واقع ارشد بک ڈپو پر اکثر بیٹھا کرتے اور کتابوں کا جائزہ لیتے رہتے۔'' ۱۷

نذیرؔ انجم کی شاعری ایک ایسے معاشرے کی عکاس ہے جس ظلم و جبر کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔آپ کا ایک حرف جذبہ حب الوطنی کا غماز ہے۔نذیرؔ انجم کا یہ شعر اتنا معروف ہوا کہ کشمیر کے بچے بچے کی زبان پر آ گیا۔

نعرہ ہی نہیں ایمان ہے، یہ آزادی کے متوالوں کا
کشمیر کا ذرہ ذرہ ہے کشمیر کے رہنے والوں کا (نذیر انجم،قرض سخن،ص۴۱)

نذیر انجم کی شاعری میں تحریکِ آزادیٔ کشمیر کا پرتو بہ آسانی دیکھا جا سکتا ہے۔اگر یہ کہا جائے کہ ان کے کئی ایک اشعار کشمیر میں روزمرہ محاورے کا درجہ رکھتے ہیں تو غلط نہ ہوگا۔

ظلم کو امن ،عداوت کو وفا کہتے ہیں
کیسے نادان ہیں صرصر کو صبا کہتے ہیں (نذیر انجم،قرض سخن،ص۵۹)

میرے کشمیر ذرا جاگ کہ کچھ جاہ طلب
غیر کو تیرے مقدر کا خدا کہتے ہیں (نذیر انجم،قرض سخن،ص۹۰)

کشمیر میں شعری ادب کے افق پر نذیرؔ انجم بیس ویں صدی کے نمایاں اور ممتاز شاعر کے طور پر جانے جاتے ہیں ۔ان کے کلام میں مزاحمتی اور ترقی پسند ادب سے وابستگی بھی واضح دیکھی جا سکتی ہے۔جیسا کہ ڈاکٹر افتخارؔ مغل لکھتے ہیں:

''انھوں نے اپنی مزاحمتی آواز کو مؤثر اور مستحکم بنانے کے لیے ترقی پسندوں کی ادبی روایت سے وابستہ علامتی نظام کو نہایت خوش اُسلوبی سے برتا ہے۔'' ۱۸

جہاں نذیر انجم انقلابی اور مزاحمتی انداز اپناتے ہوئے نظر آتے ہیں وہیں ان کے ہاں خُم و کاکل اور عشق و محبت کی داستانیں ملتی ہیں۔ وہ انقلابی انداز کے علاوہ حسن و عشق میں بھی فراز اور فیض کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ محبت کی کیفیات کو وہ یوں اپنے شعر میں سموتے ہیں کہ جیسے کسی پھول کو مالا میں پرویا جاتا ہے۔ وہ دِلی کیفیات کو کِس طرح لفظیات کا جامہ پہناتے ہیں ملاحظہ ہو:

بجھ گیا دل تو ارمان جلتے رہے

پردۂ یاس میں سوز عریاں رہا

(نذیر انجم، قرض سخن، ص ۹۴)

آئنہ گر بہت ہوئے لیکن

کوئی انجم سا عکس گر نہ ہوا

(نذیر انجم، قرض سخن، ص ۱۰۴)

نذیر انجم کی شاعری کے حوالے سے قدرت اللہ شہاب کے الفاظ دیکھیے:

''نذیر انجم کا نہایت اعلیٰ او ارفع کلام روح کے احتظاظ کا باعث بنتا ہے۔۔۔آزاد کشمیر کے صاحبانِ علم و ادب کو نازاں ہونا چاہیے کہ ایسا صاحبِ اُسلوب اور منفرد غزل گو شاعر بھی ہم میں موجود ہے۔'' ۱۹

جاوید الحسن جاوید (ا جنوری ۱۹۶۹ء) بھی آزاد کشمیر کے ادبی منظر نامے کے اہم شاعر کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ آزاد کشمیر کے شہر پلندری میں ان کی ولادت ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اپنے علاقے سے حاصل کی۔ شاعری میں ابتداً پروفیسر عبدالعلیم صدیقی سے اصلاح لی بعدازاں راول پنڈی میں پروفیسر یوسف حسن کو اپنا کلام دکھایا۔ اصغر مال کالج راول پنڈی سے انگریزی ادبیات میں ایم۔اے کی سند حاصل کرنے کے بعد آزاد کشمیر کے ضلع عباس پور میں بہ طور انگریزی لیکچرر تعینات ہوئے اسی زمانے میں پہلا مجموعہ کلام "محبت پھول کی مانند" منظر عام پر آیا۔ ۱۹۹۹ء میں سول سروسز میں سیشن افسر تعینات ہوئے اس عرصے میں دوسرا مجموعہ کلام "پون" کشمیر کلچر اکیڈمی نے شائع کیا جاوید

الحسن جاویدؔ ابتدا میں جاوید الحسن نشترؔ کے نام سے لکھتے رہے تاہم جلدی ہی نشتر کی بہ جائے جاویدؔ تخلص کرلیا دمِ تحریر جاوید الحسن جاویدؔ آزاد کشمیر حکومت میں بہ طور ایڈیشنل سیکرٹری صحت عامہ خدمات سرانجام دے رہے ہیں حال ہی میں تیسرا مجموعہ " گل وگل زار کا موسم " شائع ہوا۔

جاوید الحسن جاویدؔ کے پاس روایتی موضوعات کے ساتھ ساتھ حقیقت نگاری بھی ملتی ہے۔انھوں نے جس کو دیکھا اسے ویسا ہی بیان کردیا۔کئی حوالوں سے آپ آزاد کشمیر کی شاعری میں اہم مقام رکھتے ہیں۔وطن سے محبت، کشمیر کا نوحہ اور عشق ومحبت آپ کی شاعری کا خاص موضوع ہیں۔حالاتِ حاضرہ پر بھی آپ نے قلم کا خوب استعمال کیا ہے۔

پھر سے تعمیر وطن ہے سب حوداث کا جواب
تا نہ کوئی ہم نفس حیراں رہے گریاں رہے
تا قیامت اب نہ کوئی حادثہ گزرے یہاں
تا قیامت ہر بشر شاداں رہے خنداں رہے

(جاوید الحسن جاوید، گل وگلزار کا موسم، ص۲۳)

جاوید الحسن جاویدؔ نے عام فہم اور سادہ الفاظ میں جان دار شاعری کی ہے اُن کے ہاں دلی کیفیات اور جذبات کی بہت عمدہ عکاسی ملتی ہے۔

جیتا ہوں ،میں اچھا ہوں یونہی بول دیا ہے
سچ یہ ہے محبت نے مجھے رول دیا ہے
پوچھا تھا کسی نے یونہی احوال ہمارا
ہم سادہ مزاجوں نے تو دِل کھول دیا ہے
زنجیر ہی دیتا مرے پیروں میں تو کیا تھا
اُس نے تو مرے ہاتھ میں کشکول دیا ہے

(جاوید الحسن جاوید، گل وگلزار کا موسم، ص۴۵)

پروفیسر عبدالعلیم صدیقی (۱۹۲۵ء تا ۳ دسمبر ۲۰۰۹ء) میں ضلع سلطان پور اتر پردیش میں پیدا ہوئے۔ تقسیم ہند کے بعد ہجرت کی اور آزاد کشمیر کے ضلع سدھنوتی میں پلندری کو اپنا مسکن بنایا تمغۂ امتیاز جیسے اعزازات پانے والے عبدالعلیم صدیقی کے کئی نام و شاگرد ہوئے۔ علامہ اقبالؔ کے سارے کے سارے فارسی کلام کو منظوم اُردو ترجمہ کیا۔ اس کے علاوہ بوستان سعدیؒ، حکایات رومی اور رباعیات عمر خیام کو بھی منظوم اُردو قالب میں ڈھالا۔ پلندری میں انتقال کرنے والے عبدالعلیم صدیقی کی غزلیات کا مجموعہ "نہاں خانہ دِل" کے نام سے ان کی وفات کے بعد شائع ہوا۔

عبدالعلیم صدیقی کے کلام میں فارسیت کے ساتھ ساتھ عربی رنگ بھی موجود ہے۔ ان کا کلام کلاسیکی اور روایتی غزل سے قریب نظر آتا ہے۔ عبدالعلیم صدیقی کے ہاں فن کمال عروج پر ہے۔ ان کی شاعری بلاشبہ آزاد کشمیر کے شعرا میں اپنی الگ شناخت رکھتی ہے۔

بیمار شِفا پائے گا اے چارہ گرو کیا
دکھ اور طرح کا ہے ، دوا اور طرح کی
یہ کون بصد شوق چلادار کی جانب
لکھی ہے مشیت نے بقا اور طر ح کی ۲۰

پروفیسر عبدالعلیم صدیقی چوں کہ شاعری میں کئی شعرا کے استاد تھے۔ اہل زبان ہونے کی وجہ سے ان کو شاعری پر مکمل دسترس حاصل تھی جس کا ثبوت وہ اپنے کلام میں دیتے ہیں۔ ان کے ایک غیر مردف غزل کے یہ اشعار دیکھیں۔

ایسا کمال جاتا ہے میرا فکر و فن
آجائے حرف و صوت میں فطرت کا بانکپن
اِس کارزارِ زیست میں سرگرم رکھتی ہے
مجھ کو دِل حزیں میں اک اُمید کی کرن
ڈرتا ہوں ایسے آج سے جب میرے قلب میں
ایک خوش گوار کل کی لگن ہو نہ مؤجزن ۲۱

اپنے وطن کی مٹی کوانو کھا خراج پیش کرتے ہوئے پروفیسر عبدالعلیم صدیقی کہتے ہیں۔

جنت کی حوریں شرمائیں اس سے حسن و جوانی میں

ایسی بھی تاثیر ہے اپنے دیس کے مٹی پانی میں ۲۲

اسلم راجا (۱۳ اکتوبر ۱۹۴۸ء) آزاد جموں وکشمیر کے شعری ادب میں اپنی الگ شناخت رکھتے ہیں پتراٹہ کفل گڑھ ضلع باغ میں ولادت ہوئی۔شاعری کے علاوہ "تاریخ نامہ راجپوت" آپ کی علمی صلاحیتوں کا واضح ثبوت ہے۔" کونپل کا بدن" اور " آب ریزے " آپ کے فن کا اعتراف ہیں کئی اعزازات آپ کو آپ کی قابلیت کے اعتراف میں دیے گئے۔

اسلم راجا کے شاگردوں میں بھی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔آپ کا کلام بھی آزاد کشمیر کے شعری منظر نامے میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔

شفق جب بادلوں کے ساتھ ہم آغوش ہوتی ہے

مجھے تیری محبت کا زمانہ یاد آتا ہے ۲۳

یہ لفظ لفظ چن کر سوچوں کے ساتھ بننا

میرا یہی تو فن ہے ، جولاہا ہوں سخن کا ۲۴

سخن کا جولاہا سمیت کئی طرح کی نئی تشبیہات اسلم راجا کے کلام کا نمایاں وصف ہے اپنے شہر کو بھی کئی خوب صورتی سے عدن بتاتے ہیں ملاحظہ ہو۔

رنگوں میں میری رنگت ، خوش بو سے میری نسبت

میں باغ پالتا ہوں ، باسی ہوں میں عدن کا ۲۵

مخلص وجدانی (۲۱ مارچ ۱۹۴۴ء) ڈاکٹر صابر آفاقی کے چھوٹے بھائی ہیں۔مظفرآباد کے مضافاتی گاؤں گوہاڑی میں پیدا ہوئے۔اُردو شاعری کے علاوہ گوجری شاعری آپ کی پہچان بنی۔شاعری میں ابراحسنی (شاگرد

احسن مارہروی) سے اصلاح لی۔آپ کا مجموعہ کلام "صلیبوں کا شہر" منظرِعام پر آچکا ہے۔اس کے علاوہ ''نئی بہار نئے پھول'' آپ کا دوسرا مجموعہ ہے گوجری میں کئی مجموعے آپ کی پہچان بنے۔ڈاکٹر جمیل جالبی،مخلصؔ وجدانی کی شاعری کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

''آپ کی شاعری میں ذاتی تجربے، اجتماعی واردات سے گھل مل کر ایک وحدت بن رہے ہیں اور اس تخلیقی عمل سے ایک ایسا امکان سامنے آرہا ہے جو منفرد بھی ہے اور مؤثر بھی۔''۲۶

مخلصؔ وجدانی کی شاعری میں مقامی علامات واستعارات کا استعمال خوب صورتی سے کیا گیا ہے۔ بہ غور مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مخلصؔ وجدانی کی غزل میں بے شمار نفسیاتی واقعاتی اور وارداتی عوامل کا اجتماع ملتا ہے۔ان کی غزل میں اُن کی جنم بھومی سے محبت نظر آتی ہے۔ان کا انداز اس قدر دِل پذیر ہے کہ قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔کبھی ان کے کلام میں قاری خود کو غرق پاتا ہے اور کبھی سطح پر تیرتا ہے۔مخلصؔ وجدانی کی شاعری کے حوالے سے جگن ناتھ آزاد رقم طراز ہیں:

''نام نہاد جدید شعرا کے ہجوم میں مخلصؔ وجدانی ایسے شاعر کے کلام کا نظر میں آجانا ایسا ہی ہے جیسے دھوپ میں چلتے ہوئے مسافر کے لیے کہیں سے ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آجائے۔''۲۷

مخلصؔ وجدانی نے اپنی غزل میں ایسے ایسے جوہر دکھائے ہیں کہ وہ آزاد کشمیر کے شعری ادب میں منفرد مقام حاصل کر چکے ہیں۔ان کے شعروں میں ذہن کا کرب، گردوپیش کا غم، مجبوریوں، معذوریوں کا ماتم جابہ جا ملتا ہے۔وہ اپنے ہم وطنوں کے دکھ سے اور ان کے مسائل سے پوری طرح آشنا ہیں ان کی فکری سطح جدت کی حامل ہے۔جبھی تو ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے کہا کہ۔

''آپ کی شاعری بہ اعتبار فکرِ نو اور اُسلوب تازہ گوہرِ نایاب ہیں۔''۲۸

مخلصؔ وجدانی کی شاعری سے کچھ اشعار مثال کے طور پر دیکھیں۔

آؤ سب مل کر فصیلِ شہر کو اونچا کریں
ہے سلامت شہر تو محفوظ اپنا گھر بھی ہے

(مخلص وجدانی،صلیبوں کا شہر،ص ۱۷)

ترا غم ہے ان مول شے اِس جہاں میں
یہ جنس گراں، جس کو بھی راس آئے

(مخلص وجدانی،صلیبوں کا شہر،ص ۳۵)

زمانے کے کوئی معیار پر اترا نہیں مخلصؔ
خرد کو دار پر کھینچا ، جنوں پر سنگ باری کی

(مخلص وجدانی،صلیبوں کا شہر،ص ۴۳)

لیاقتؔ شعلان (۱جنوری ۱۹۷۹ء) آزاد کشمیر کے لکھنے والوں میں نو وارد ہیں۔لیاقتؔ شعلان کا اصلی نام محمد لیاقت خان ہے آپ کیاٹ کلاں راولاکوٹ میں پیدا ہوئے۔ایم اے اُردو تک تعلیم مکمل کرنے کے بعد ایک مقامی اسکول میں بہ طور جونیئر مدرس پڑھا رہے ہیں۔لیاقتؔ شعلان ک شاعری وارداتِ قلبی کی شاعری ہے۔اُن کو غزل میں کمال مہارت حاصل ہے۔ان کی غزل جان دار اور عمدہ ہے۔یہی وجہ ہے کہ ادبی محافل میں وخوب جانے جاتے ہیں۔لیاقتؔ شعلان کی غزل سے کچھ اشعار دیکھیں۔

ہیں وہ حالات کہ خاموش رہوں، اف نہ کروں
کاٹا جاتا ہوں کہیں میں بھی شجر کے اندر
اتنا منصب سے ہوا جاتا ہے غافل انسان
روتے دیکھا ہے خدا میں نے بشر کے اندر ۳۴

تاریخ دکھائے گی زمانے کو یہ منظر
طوفانی ہوا سے یہ دیا کتنا لڑا ہے ۳۵

کتنی بار پیاسے مرے ہیں خوش فہمی کے ہاتھوں
لیکن اب تک اترے نہیں ہیں دریا سرابوں والے ۳۶

صحرا نے خود اپنی آگ سے پیاس بجھائی اپنی
جنگل جنگل برس رہے تھے دور سحابوں والے ۳۷

علامہ جوّادؔ جعفری (۴ جنوری ۱۹۵۶ء) آزاد کشمیر کے شعری روایت کے ایک اہم شاعر ہیں۔آزاد کشمیر کے ضلع باغ میں ولادت ہوئی۔ جوّادؔ جعفری کو جو ماحول میسر آیا اس نے ان کے شعر وادب سے دلچسپی پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ان کی علمی قابلیت نے ان کو شاعر کے ساتھ ساتھ عمدہ نثر نگار بھی بنا دیا۔ چودھری غلام عباس کی شخصیت، رومیِ کشمیر میاں محمد بخش کے علاوہ سردار عبدالقیوم خان کی زندگی پر تصانیف ان کے فن کا ثبوت ہیں۔شاعری میں آپ کا مجموعۂ کلام ''احتجاج'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے جب کہ ''فکرِ امروز'' زیرِ طبع ہے۔ جوّادؔ جعفری نے فارسی زبان پر دسترس کے بدولت اِس زبان سے خوب استفادہ کیا۔انھوں نے ریڈیو آزاد کشمیر سے وابستگی کے دوران میں کئی طرح کے اعزازات حاصل کیے۔علاوہ ازیں کشمیر کلچر اکیڈمی کے صدر نشین کی حیثیت سے بھی انھوں نے اُردو، فارسی اور کشمیری ادب کو بڑی تعداد میں شائع کر کے بھی ادب کی خدمت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

جوّادؔ جعفری کی شعر وادب سے وابستگی بچپن سے ہی رہی بارہ برس کی عمر میں "برسات کا موسم" کے عنوان سے نظم لکھی۔ جوشؔ ملیح آبادی، احمد ندیمؔ قاسمی، احمد فرازؔ، اور افتخارؔ عارف جیسے بڑے شاعروں کی صحبت میں آپ کے شعر کہنے میں نفاست اور تازگی آئی۔ جوّادؔ جعفری نے حالاتِ حاضرہ کو اپنے شعروں میں سمونے کا کامیاب تجربہ کیا ہے۔ان کا کلام ایک دھرتی کی نمائندگی کرتا ہے۔ جذبات واحساسات ان کی شاعری کا خاص وصف ہے۔ وہ اپنے وطن، اپنی مٹی اور اپنی دھرتی سے جو محبت کرتے ہیں وہ ان کی شاعری میں دیکھی جا سکتی ہے۔ جوّادؔ جعفری اپنی شاعری

کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

''مجھے معلوم ہے کہ یہ نقار خانے میں طوطی کی آواز ہے یا پھر ایک شبِ تاریک میں ٹوٹے ہوئے مٹی کے چراغ کی لو،لیکن مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس آواز کا اپنا ایک آہنگ ہے جو اپنا وجود ضرور برقرار رکھے گا،اور اس ٹوٹے ہوئے چراغ سے نکلنے والی روشنی گھمبیر اندھیروں میں اجالوں کی نمائندگی کا عظیم فریضہ سرانجام دے گی۔''۳۳

علامہ جوادؔ جعفری کے کلام سے کچھ اشعار بہ طور نمونہ دیکھیے۔

ابنِ آدم کو ملی کن گناہوں کی سزا
لغزشِ آدم کا واجب ہم پہ کفارہ نہ تھا

(جواد جعفری،احتجاج،ص۶۰)

جنھیں معلوم نہ ہو فرق الفت اور نفرت کا
انھیں چاہتے اگر ہیں آپ تو بے کار چاہتے ہیں

(جواد جعفری،احتجاج،ص۶۵)

تعلُق کچھ نہ کچھ جوادؔ کا ان سے تو ہے اب بھی
اسے چاہیں نہ چاہیں اس کے وہ اشعار چاہتے ہیں

(جواد جعفری،احتجاج،ص۶۵)

گنوایا تم نے مجھ کو ہر قدم پر
تجھے میں ہر قدم پر پا گیا ہوں

(جواد جعفری،احتجاج،ص۶۰)

نازؔ مظفرآبادی (۱جنوری ۱۹۶۰ء) آزاد کشمیر کے شعروادب کی روایت میں نازؔ مظفرآبادی کا نام بھی اہمیت کا حامل ہے۔مظفرآباد میں پیدا ہوئے۔ابتدائی عمر سے ہی شعرگوئی کی طرف رجحان تھا۔غزل اور نظم دونوں میں طبع

آزمائی کی۔ ناؔز مظفر آبادی کے چار شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی شاعری پر پروفیسر سحؔر انصاری لکھتے ہیں۔

> ''ناؔز مظفر آبادی کہنہ مشق شاعر ہیں۔۔۔ وہ اپنے سخن کو سنوارنا اور نکھارنا چاہتے ہیں۔ شاعری ان کے لیے زندگی کا سنجیدہ مسئلہ ہے اس لیے وہ توجہ اور انہماک سے اپنے فن کا معیار قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔''۳۴

ناؔز مظفر آبادی غزل کے شاعر ہیں اور غزل ہی کا مزاج رکھتے ہیں لیکن ان کی نظمیں بھی کئی طرح سے خصوصیت کی حامل ہیں۔ ان کی شاعری کا بڑا حصہ حقیقت اور جذبات کی غمازی کرتا ہے۔ ناؔز مظفر آبادی نے چوں کہ زندگی کا بڑا حصّہ غریب الوطنی میں بسر کیا اس وجہ سے یہ چیز بھی ان کے کلام میں شامل نظر آتی ہے۔ ان کی شخصیت ان کے کلام میں جھلکتی ہے ناؔز مظفر آبادی کے کلام سے چند مثالیں دیکھیے۔

وہ تو ظرف تھا ایک سمندر کا
ورنہ دکھ دریاؤں جیسا تھا

(ناز مظفر آبادی، ہم سُخن، ص۲۴)

سوچ کر قدم رکھنا عشق کی عدالت میں
عمر بیت جاتی ہے فیصلہ نہیں ہوتا

(ناز مظفر آبادی، ہم سُخن، ص۳۰)

جذبہ عشق اگر دل میں نہیں ہے زندہ
آدمی صاحب ایمان نہیں ہوتا

(ناز مظفر آبادی، ہم سُخن، ص۴۵)

وہ کسی ایک کا بھی ہو نہ سکا
ہاں اسی بات کا تو رونا تھا

(ناز مظفر آبادی، ہم سُخن، ص۸۱)

زکریا شاؔز (۱۹۶۵ء) آزاد کشمیر میں زکریا شاؔز بھی غزل کے حوالے سے معتبر نام ہے۔ آزاد کشمیر کے ضلع

کوٹلی سے تعلق رکھنے والے زکریا شازؔ اپنی غزل کے داخلی و خارجی دونوں سطحوں پر یکساں توجہ دیتے ہیں۔آپ کا مجموعہ کلام ''خاموشی کی کھڑکی سے'' ۲۰۱۴ء میں شائع ہوا۔زکریا شازؔ کی غزل کلاسیکی روایت کے گہرے مطالعے کا پتا دیتی ہے اُن کی غزل میں تصورات کا عنصر زیادہ ملتا ہے۔زبان و بیان کے اعتبار سے اُن کا کلام خاص اہمیت کا حامل ہے۔ان کے مضامین زیادہ تر داخل سے برآمد ہو کر خارج میں وارد ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔دریائے پونچھ کے کنارے زندگی کے شب و روز گزارنے والے زکریا شازؔ کے ہاں محبت نمایاں موضوع ہے جس کو انھوں نے بری کامیابی کے ساتھ نبھایا ہے۔ان کی جزئیات نگاری اور معاشرے کی مختلف قدروں کی عکاسی بھی خاص وصف بن چکی ہے۔ان کے ہاں مضامین اور کیفیات میں یکسانیت فنی معیار اور ابلاغ کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتی لیکن موضوعاتی پھیلاؤ کو قدرے محدود کر دیتی ہے۔جس کی بنا پر فکری یکسانیت کے سلسلے میں جس کا احساس ہوتا ہے۔محبت کے موضوعات میں زکریا شازؔ کی ثروت مندی پر محمد اظہارؔ الحق لکھتے ہیں۔

> ''محبت کے باب میں اُس نے مضامینِ نو لانے کی کوشش کی ہے اور یہ کوشش بہت حد تک کامیاب رہی ہے۔اس نے نقشے کے بغیر محبت کے راستے پر چلنے کی دعوت دی ہے۔۔۔سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے زمانے سے الگ چلنے کا اہتمام کیا ہے۔''۳۵

زکریا شازؔ خیال و معنی کو شعری سرمایہ سمجھتے ہوئے اس کے تمام تر لوازمات کو نبھاتے ہیں۔زکریا شازؔ کے کلام سے یہ اشعار ان کے اُس وصف کو سمجھنے میں مدد دیں گے۔

پیار کا ساون برستا ہے تو تھمتا ہے کہاں
بھیگتا ہوں میں اِدھر اور وہ اُدھر بارش کے بیچ

(زکریا شاز، خاموشی کی کھڑکی سے، ص۳۲)

اب لطف کے اسرار نہیں کھلتے ہیں مجھ پر

کر مجھ سے ملاقات کسی اور طرح سے

(زکریا شاز، خاموشی کی کھڑکی سے، ص۴۱)

اس نے اس بار تو حیران ہی کر ڈالا ہے
میں سمجھتا تھا کہ جذبات سمجھتا ہے کوئی

(زکریا شاز، خاموشی کی کھڑکی سے، ص۴۹)

شازؔ خود میں ہی گنواتے ہوئے خود کو رکھنا
ہاتھ جب تک نہ کوئی اپنی نشانی آئے

(زکریا شاز، خاموشی کی کھڑکی سے، ص۵۶)

ڈاکٹر وزیر آغا کے بہ قول:

"زکریاؔ شاز کی غزل جدید لب و لہجے کی حامل ہے کہیں بھی
شاعر کی بھیگی ہوئی آواز جذباتی خروش میں تبدیل نہیں ہوتی۔" ۳۶

سید شہبازؔ گردیزی (۱۹۷۶ء) کا تعلق آزاد کشمیر کے ضلع باغ سے ہے۔ آپ کی پیدائش حیدر آباد سندھ میں ہوئی۔ شاعری کا شغف ابتدائی عمر سے ہی تھا۔ شہبازؔ گردیزی نے اپنے اس شوق کو پروان چڑھایا اور شاعری میں پروفیسر شفیقؔ راجا اور ڈاکٹر افتخارؔ مغل سے اصلاحِ سخن لی۔ ان کے ہاں جذبات و احساسات کی ملی جلی فضا نظر آتی ہے۔ شہبازؔ گردیزی کے دو شعری مجموعے "حقیقتوں کے عذاب" اور "خواب کون دیکھے گا" منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ اس کے علاوہ شعرائے ضلع پونچھ کا انتخاب "اجلی مٹی" کے نام سے شائع کرنے کا اعزاز بھی رکھتے ہیں۔ "متاعِ حسن" کے عنوان سے تاریخ کشمیر اور "جمہوریت کی دیوی" کے نام سے اخباری کالمز کا مجموعہ بھی شہبازؔ گردیزی کی صلاحیتوں کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ طلوعِ ادب آزاد کشمیر کے معتمدِ اعلیٰ چیئرمین افکار پاکستان، صدر حسنِ بیان آزاد کشمیر، ممبر کشمیر کلچرل بورڈ کے علاوہ کئی ادبی تنظیموں سے وابستگی رکھتے ہیں۔ ۲۰۰۵ء میں ان کو کلچر کلچرل اکیڈمی ایوارڈ مل چکا ہے۔ ۲۰۰۹ء میں امیزنگ فیلڈ کارکردگی ایوارڈ ۲۰۱۱ء میں مرسی کور کارکردگی ایوارڈ کے علاوہ کئی طرح کے اعزازات

حاصل کر چکے ہیں۔سید شہبازؔ گردیزی دیگر شعرا کی طرح محبت کی جذبوں سے لبریز ہیں جب کہ جذبہ حب الوطنی آپ کی شاعری کا خاصا ہے۔خواب سید شہبازؔ گردیزی کا ایک کامیاب استعارہ ہے وہ خواب دیکھتے ہیں آزادیٔ کشمیر کا خواب، امن وقرار کا خواب، محبت و آشتی کا خواب یہی وجہ ہے کہ ان کو یہ دھڑ کا لگا رہتا ہے کہ ان کے بعد ان کے یہ خواب کہیں دم نہ توڑ دیں۔ڈاکٹر افتخارؔ مغل لکھتے ہیں۔

''سید شہبازؔ گردیزی کی شاعری میں خواب کا استعارہ ایک نئے تصور، ایک نئی معنویت، ایک نئے رنگ ایک نئے امکان اور ایک نئے روپ کے ساتھ آیا ہے سید شہبازؔ گردیزی خواب کا خواب دیکھ لینے پر قادر ہے اس کے ہاں خواب ایک پرچھائی نہیں ایک مکمل امکان ہے وہ اس امکان کے امکان میں جھانک لیتا ہے وہ اپنے وجدان سے اپنے Vision کے کیمرے سے خواب کے پس منظر کی تصویر لے لیتا ہے۔'' ۳۷

سید شہبازؔ گردیزی کے کلام میں خوابوں کا بیان اس قدر نفاست سے ملتا ہے کہ قاری کے دِل پر ایک کیف و سرور کی سی سرشاری چھا جاتی ہے۔ان کے کلام سے یہ اشعار بہ طور مثال:

عجیب طرح کے خوابوں سے واسطہ ہے مرا
عجیب ہی مرے دِل میں خیال آیا ہے

(شہباز گردیزی،خواب کون دیکھے گا،ص۱۶)

اس اک بات پر اٹکی ہوئی ہے سانس میری
میں مرگیا تو میرے خواب کو ن دیکھے گا

(شہباز گردیزی،خواب کون دیکھے گا،ص۲۶)

تری آنکھوں میں یہ جو خواب سا ہے

اسے میں نے کہیں دیکھا ہوا ہے

(شہباز گردیزی، خواب کون دیکھے گا، ص ۳۰)

اتنے محتاط ہیں ہم لوگ تری دُنیا میں

اپنی آنکھوں سے بھی کچھ خواب چھپا کر دیکھے

(شہباز گردیزی، خواب کون دیکھے گا، ص ۷۵)

سرخ آنکھوں کا حال مت پوچھو

شب گزاری ہے اضطراب کے ساتھ

(شہباز گردیزی، خواب کون دیکھے گا، ص ۸۱)

احمد عطاؔاللہ (۱۰ اپریل ۱۹۶۵ء) خطہ کشمیر سے متعلق ایک اور اہم شاعر احمد عطاؔ اللہ ہیں۔ احمد عطاؔاللہ کے والدین بسلسلہ روزگار لاہور میں مقیم ہیں یہی وجہ ہے کہ انھوں نے لاہور میں ہی جنم لیا۔ اپنی تعلیم لاہور میں ہی مکمل کی۔ ۱۹۸۹ء میں اُردو زبان وادب میں گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے کیا۔ اسی ادارے میں عباس تابشؔ کی صحبت نے آپ کو باقاعدہ شاعر بنا دیا۔ عباس تابشؔ آپ کے سینئر تھے۔ احمد عطاؔاللہ لاہور میں احمد ندیمؔ قاسمی کی صحبت سے بھی مستفید ہوئے۔ یہی وجہ ہے ان کے کلام میں دیہات اور گاؤں کی زندگی جا بہ جا موجود ہے۔ ترقی پسندی کے عناصر بھی احمد عطاؔاللہ کی شاعری کا خاصا ہیں۔

احمد عطاؔاللہ جدید لفظیات کے شاعر ہیں ان کے امکانات بالکل تازہ جب کہ اُسلوب جداگانہ اور منفرد ہے۔ وہ ایک فطرت شناس اور زندگی کا گہرا مشاہدہ رکھنے والے انسان ہیں۔ دیہی خصوصیات اُن کی شاعری میں ملتی ہیں۔ شعری تخیل اور فکری سطح پر ان کے تمام اشعار میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ احمد عطاؔاللہ گاؤں کی فطری محبت کے اسیر ہیں ان کے مطابق گاؤں میں محبتوں کا موسم شہروں کی نسبت زیادہ ہے جب کہ فطری حسن بھی گاؤں میں ہی ملتا ہے۔ ان کی شاعری میں لہجے کا نیا پن اور محبت کا غیر روایتی اظہار بھی انوکھے انداز میں موجود ہے۔ احمد عطاؔاللہ کا خاص اُسلوب جہاں بڑی سے بڑی غیر معمولی بات کو سادہ الفاظ کی لڑی میں پرو سکتا ہے۔ وہاں ان کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ آپ بات کو قاری کی ذہنی سطح کے مطابق بیان کرتے ہیں۔ وہ خارجیت سے زیادہ داخلیت پر محنت کرتے

ہیں۔احمد عطاؔاللہ نے غزل کے میدان میں نئے مضامین لانے کی کوشش کی ہے اپنی اس کوشش میں وہ خاصی حدتک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ظفرؔ اقبال ان کی شاعری کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''جولوگ میری نحوست طبع سے واقف ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میرا یہ اعتراف کیا معنی رکھتا ہے اور اپنی تمام تر بدلحاظی کے باوجود میرا سے عمدہ، بلکہ قابل رشک قرار دینے کا مطلب کیا ہے مجھے اس شاعر نے خوش کیا ہے اور واقعتاً یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔'' ۳۸

احمد عطاؔاللہ کے کلام میں سے نمونے کے طور پر کچھ شعر درج ذیل ہیں۔

سازشی دِل تجھے ہمت نہیں ہونے دوں گا
دوسری بار محبت نہیں ہونے دوں گا

(احمد عطااللہ، ہمیشہ،ص۳۵)

بیچ رستے کے روک دوں گا تجھے
زندگی! میں بھی دیکھ لوں گا تجھے

(احمد عطااللہ، ہمیشہ،ص۳۹)

پہلے ہی یقین شہر پر گاؤں نہیں کرتا
کیا سوچے گا واپس میں دوبارہ نہ گیا تو

(احمد عطااللہ، ہمیشہ،ص۴۶)

شہر گاؤں کی نیندیں چرالیں جس کی خوش بو نے
وہ کیسا پھو ل تھا کب بات سے باہر نکل آیا

(احمد عطااللہ، ہمیشہ،ص۸۷)

ایازؔ عباسی آزاد کشمیر کے ضلع باغ میں پیدا ہوئے بچپن سے ہی شعروادب کی طرف رغبت تھی۔ابتدا میں نظم اور ہائیکو لکھیں تاہم غزل اور نعت میں پہچان بنائی۔ایازؔ عباسی مقدار سے زیادہ معیار کو ترجیح دیتے ہیں۔ایازؔ عباسی کا

مجموعہ کلام "ظہور" کے نام سے منظرِ عام پر آ چکا ہے۔ جب کہ دوسرا مجموعہ زیرِ طبع ہے۔ ایاز عباسی کی شاعری میں حبِ رسولؐ بھی موجود ہے اور حب الوطنی بھی۔ خم و کاکل بھی ہے اور عشق و محبت بھی ایاز عباسی اپنے جذبات کو غزل اور نظم کے لبادے میں بہت نفاست کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ تلخیٔ ایام اور کربِ محبت ان کا اہم ترین موضوع ہے۔ وہ کبھی چلچلاتی دھوپ میں سفر کرتے ہیں تو کبھی گھنی چھاؤں میں پڑاؤ ڈالتے ہیں۔ یادوں کی اک بستی کے مکین ایاز عباسی قلم اور زبان کے ارزاں الفاظ رکھتے ہیں۔ ان کے مطابق عشقِ محمدﷺ وہ شے ہے کہ جو زمانے کے ظلم و ستم سے اور اذیتوں سے محفوظ رکھ سکتی ہے۔ ایاز عباسی کی شاعری میں حقیقت نگاری اور واردات قلبی یکساں طور پر ملتی ہیں۔ ان کے مجموعہ کلام سے چند اشعار دیکھیے۔

عمر تیری بھی ماہ و سال میں ہے
بادشاہا ! تو کس خیال میں ہے

(ایاز عباسی، ظہور، ص، ۹۷)

ساربان اُونٹنی پر بیٹھتا تھا
جب عمرؓ کو مہار دی گئی تھی

(ایاز عباسی، ظہور، ص، ۹۹)

منقبت ہدیہ کروں حضورؐ کے گھرانے کے لیے
لفظ منت کریں تحریر میں آنے کے لیے

(ایاز عباسی، ظہور، ص، ۲۱)

اس زمانے نے تو بس مار ہی ڈالا ہوتا
مصطفیٰؐ نے نہ اگر ہم کو سنبھالا ہوتا

(ایاز عباسی، ظہور، ص، ۹۷)

الطاف عاطف (۲۲ دسمبر ۱۹۵۰) آزاد کشمیر کے شعری ادب کی روایت میں کیپٹن (ر) الطاف عاطف کا نام بھی جانا پہچانا جاتا ہے۔ آزاد کشمیر کے ضلع باغ کے مشہور گاؤں کفل گڑھ میں پیدا ہوئے۔ ایف۔ اے انٹر کالج باغ

اور گریجویشن جامعہ پنجاب، لاہور سے مکمل کرنے کے بعد آرمی ایجوکیشن کور میں جونیئر کمیشن حاصل کیا۔اپنی خدمات ملک وقوم کے لیے پیش کرتے ہوئے ۲۰۰۳ء میں بہ طور آنری کیپٹن ریٹائر ہوگئے۔

باغ آزاد کشمیر میں پہلی طلبہ تنظیم کا بانی وصدر ہونے کا منفرد اعزاز رکھنے والے الطافؔ عاطف نے اپنے کالج کے عرصے میں ۱۹۶۷ء سے شاعری میں طبع آزمائی شروع کردی۔طویل مشقِ سخن کے بعد ۲۰۱۲ء میں پہلا مجموعہ کلام ''جھیل کا چاند'' کے نام سے منظرِ عام پر آیا۔باغ کی کوئی بھی ادبی محفل آپ کے ذکر اور آپ کی شرکت کے بعد نامکمل تصور کی جاتی ہے۔ریٹائرمنٹ کے بعد آپ کی مکمل توجہ شعر وسخن پر مرکوز ہے یہی وجہ ہے کہ آپ کا دوسرا مجموعہ کلام بھی زیرِ طبع ہے۔

توانا اور مثبت شعری سوچ کے حامل الطافؔ عاطف کے کلام میں ہر طرح کے موضوعات ملتے ہیں۔ان کے کلام کو دیکھ کر قاری بآسانی اندازہ کرسکتا ہے کہ زندگی کا بیشتر حصہ فوج میں گزارنے والا یہ شاعر موضوعات کی کمی کا ہرگز شکار نہیں رہا۔وہ محبت کے لازوال جذبے کے مختلف پہلوؤں کو موضوعِ سخن بناتے ہیں۔سید شہبازؔ گردیزی کے مطابق:

> ''انھوں نے زندگی میں بے شمار نشیب وفراز دیکھے ہیں حادثاتِ زمانہ پر گہری نظر رکھی ہے اس لیے ان کی شاعری میں روایت اور جدت کا حسین امتزاج اور تنوع پایا جاتا ہے۔ان کی شاعری میں جہاں حال کا عکس نمایاں ہے وہاں ماضی اور مستقبل کی جھلک بھی پائی جاتی ہے۔۳۹

عزم وہمت کے جذبات کے حامل الطافؔ عاطف ہمیشہ حالات کے روشن پہلو تلاش کرتے ہیں۔اِن کے کلام سے چند اشعار نمونے کے طور پر دیکھیے۔

جلوہ تمھارے حسن کا ہر پھول میں عیاں
چرچے ہیں پھر بھی دہر میں تیرے حجاب کے

(الطاف عاطف،جھیل کا چاند،ص ۲۱)

جو تو بچھڑا تو لگتا ہے مجھے ایسا

کہ جیسے میں سمند ر پار بیٹھا ہوئے

(الطاف عاطف، جھیل کا چاند، ص۳۴)

چپکے چپکے جھانکتی رہتی ہیں جب بھی
راز کی باتیں بتاتی ہیں یہ آنکھیں

(الطاف عاطف، جھیل کا چاند، ص۴۱)

زندگی ہاری ہے عاطفؔ جن کی خاطر
روپڑے وہ ، بات آئی جب سمجھ میں

(الطاف عاطف، جھیل کا چاند، ص۵۲)

چین آتا نہیں انھیں عاطفؔ
دوسروں کا جو دِ ل دکھاتے ہیں

(الطاف عاطف، جھیل کا چاند، ص۲۱)

محمد خان نشترؔ (۱۹۲۷ تا ۱۹۸۵) آزادکشمیر کی ایک منفرد پہچان ہے۔ اُردو شاعری میں آپ روایت کی پاسداری کرتے ہیں۔ محمد خان نشترؔ نے آزادکشمیر میں اُردو شعر و ادب کے فروغ کے لیے گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔ محمد خان نشترؔ کے بیٹے زاہدؔ کلیم کے مطابق ۱۹۲۷ میں مظفرآباد شہر میں پیدا ہوئے۔ ۱۶ سال کی عمر میں والدہ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ طالب علمی کے زمانے میں سیر و سیاحت کے ساتھ ساتھ مضامین نویسی علم و ادب اور کھیلوں میں دل چسپی لینے کے ساتھ ساتھ علامہ اقبالؔ کو بھی بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ اپنے اس دور میں بال جبریل کو سرخ اور نیلی روشنائی سے خوش خط لکھ کر اپنے ادبی ذوق کا ثبوت دیا۔ معاشی طور پر زیادہ سازگار حالات نہ تھے۔ محکمہ جنگل میں کلرک کی حیثیت سے ملازمت کرتے رہے۔ زاہدؔ کلیم کے مطابق:

''محکمہ جنگل میں تمام عمر کلرکی کی ،لیکن شرافت اور وضع داری کے سبب افسرانِ بالا بھی ہمیشہ احترام کرتے تھے ۱۹۷۶ء میں ملازمت سے سبک دوش ہوکر ذوق کی تسکین کے لیے کتابوں کی دُکان ''نیلم بک ڈپو'' کے نام سے کھول لی جو کہ دُکان کم اور مرکزِ علم وادب زیادہ تھی۔'' ۴۰

محمد خان نشترؔ نے اپنی زندگی علم و ادب کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ ان کی یادگار ایک تاریخ ''رشحات نشتر'' اور ایک مجموعہ شاعری ''لمحات نشتر''،ان کی وفات کے بعد شائع ہوئے محمد خان نشترؔ اپنے وقت کے اہل سخن سے رابطے میں تھے اس وقت کے تمام رسائل وجرائد با قاعدگی سے آپ کو ارسال کیے جاتے تھے۔

محمد خان نشترؔ فشار خون کے مریض تھے اواسی سبب ۲۸ مئی ۱۹۸۵ء برین ہیمرج کا شکار ہوکر دُنیا سے رخصت ہوئے۔ زاہدؔ کلیم کے مطابق:

''وفات سے کچھ وقت پہلے میرے چھوٹے بھائی زبیر کو بلا کر آخری شعر لکھوایا جو بعدازاں قبر کے کتبے پر کندہ کیا گیا۔'' ۴۱

محمد خان نشترؔ کا یہ آخری شعر ان کی پہچان بن گیا۔ بلا شبہ یہ ایک زندہ شعر ہے جو صداقت کے ساتھ ساتھ اپنے اندر ایک کرب اور دکھ رکھتا ہے۔ یہ شعر اس بات کی بھی غمازی کرتا ہے کہ موت سے کوئی بچ نہیں سکتا بڑے سے بڑا جابر بھی اک روز موت کے چنگل میں آئے گا۔

نشترؔ بہت دکھاتے تھے دم خم حیات میں
یہ کیا ہوا کہ ایک ہی ہچکی میں سو گئے

(محمد خان نشتر،لمحات نشتر،ص۷۳)

مری نزاکتِ احساس اس زمانے میں
ہجومِ لالہ و سرووسمن سے روٹھ گئی

(محمد خان نشتر،لمحات نشتر،ص۸۰)

پھر زندہ ہورہی ہیں روایات ِ دشتِ قیس
محشر ، خرام لیلی شام و سحر میں ہے

(محمد خان نشتر،لمحات نشتر،ص۹۸)

یہ حادثہ بھی دل نے ہے یک سر بھلادیا
وہ کب ملے کہاں ملے اور مجھ سے کیوں ملے

(محمد خان نشتر،لمحات نشتر،ص۴۷)

اکرم سہیل (۱۹۵۵ء) آزاد کشمیر کی شعری روایت میں اکرم سہیل کا نام خاصا معروف ہے۔اکرم سہیل کی شاعری حقیقت کی شاعری ہے۔ جہاں کوئی واقع رہنما ہوتا دیکھا فوراً اسے موزوں کرلیا۔ترقی پسند تحریک کا حصہ نہ ہوتے ہوئے بھی ترقی پسند شاعری کو پسند کرتے ہیں۔کوٹلی آزاد کشمیر کے ڈگری کالج سے گریجویشن کرنے کے بعد پنجاب یونی ورسٹی سے لا کا امتحان پاس کیا۔مختلف اعلیٰ سرکاری عہدوں پر تعینات رہے۔دمِ تحریر پبلک سروس کمیشن ،آزاد کشمیر کے ممبر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دینے کے ساتھ ساتھ ادب کے لیے بھی بھرپور خدمات جاری رکھی ہوئی ہیں۔۲۰۱۶ء میں اولین شعری مجموعہ ''نئے اُجالے ہیں خواب میرے'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔اکرم سہیل کی شاعری کے حوالے سے ڈاکٹر مقصود جعفری لکھتے ہیں۔

''اکرم سہیل کی شاعری روایت اور جدت کا حسین سنگم ہے۔افکار جدید ہیں اور لہجہ روایتی ہے۔۔۔آزادی اور مساوات ان کا مسلک اور انسان دوستی مذہب ہے۔''۴۲

اکرم سہیل کی شاعری کے چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

غریب ، مفلس و محکوم کی یہ قسمت ہے
مرے نہ جو وہ دھماکوں سے مارا جائے گا

(اکرم سہیل، نئے اُجالے ہیں خواب میرے،ص۱۸۹)

بس اہلِ درد ہی جانیں یہ زبانِ درد
سخن ہے ایسا کہ محتاج قیل و قال نہیں

(اکرم سہیل، نئے اُجالے ہیں خواب میرے،ص۲۰۵)

جھول کر دار پر منصور نے قاتل سے کہا
ہم کہاں مرتے ہیں مصلوب دوبارہ کیجیے

(اکرم سہیل، نئے اُجالے ہیں خواب میرے،ص۲۰۸)

شفیق راجا (۴فروری ۱۹۵۶ء) آزاد کشمیر کے ضلع باغ میں پیدا ہونے والے راجا محمد شفیق خان ادبی دُنیا میں شفیق راجا کے نام سے جانے جاتے ہیں۔شفیق راجا نے ایم اے اُردو تک تعلیم حاصل کی پھر درس و تدریس سے وابستہ ہو گئے پرنسپل کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ضلع باغ میں آپ کے شاگردوں کا ایک وسیع حلقہ ہے جن میں سید شہباز گردیزی معروف شاعر ہیں۔پروفیسر عبدالعلیم صدیقی کے مطابق:

''ان کے کلام میں فکر کی ندرت بھی ہے اور اظہار کی دلاویزی بھی۔شاعری کی فطری استعداد کو وسیع مطالے نے جلا بخشی ہے اور زبان و بیان کو دِل کش اور موثر بنایا ہے۔وہ قدیم و جدید شعری اسالیب سے بہ خوبی واقف ہیں روایت سے بغاوت نہ کرتے ہوئے رویوں کو اپنایا ہے''۴۳

شفیق راجا کے کلام میں جذبہ حب الوطنی اور حسن و محبت کے موضوعات بہ کثرت ملتے ہیں۔آسان و عام فہم زبان ان کے کلام کا خاصا ہے۔شفیق راجا کا پہلا مجموعہ ''میں حرف حرف سمیٹوں''۱۹۹۸ء میں منظر عام پر آیا۔آپ باغ کی سب سے فعال ادبی تنظیم طلوع ادب کے صدر نشین اور بانی ہونے کے علاوہ پہاڑی ادبی سنگت کے بھی ضلعی صدر ہیں۔شفیق راجا کے مجموعہ کلام میں سے چند اشعار دیکھیں۔

ستم کی ، ظلمت کی ماری ہوئی رُتیں کب تک
مرے وطن تیری قسمت میں ظلمتیں کب تک

(شفیق راجا، میں حرف حرف سمیٹوں،ص۴۵)

ایک حیرت کا سمندر موٗجزن پاتے ہیں ہم
جب تخیل میں کبھی کرتے ہیں ہم پیکر شمار

(شفیق راجا، میں حرف حرف سمیٹوں، ص۶۲)

مرے خیال کی حرمت اِسی سے قائم ہے
کہ تیرے پیار نے کرنا ہے سرخرو مجھ کو

(شفیق راجا، میں حرف حرف سمیٹوں، ص۸۳)

احسنؔ سلیمان (۲۸ مئی ۱۹۹۱) آزاد کشمیر کے ضلع کوٹلی کے گاؤں تتہ پانی میں پیدا ہوئے۔ احسنؔ سلیمان کو اسکول دور سے ہی شعروادب سے دلچسپی پیدا ہوگئی جس کی بنیادی وجہ کم سنی میں ہی کتاب سے محبت ہے۔ پروینؔ شاکر، احمد فرازؔ، جونؔ ایلیا اور ساغرؔ صدیقی سے متاثر رہنے والے احسن سلیمان نے سید شہبازؔ گردیزی سے اصلاح لی ۔لیکن خداداد صلاحیتوں کی بدولت سرشت میں شاعری کا ملکہ موجود تھا لہذا ستمبر ۲۰۱۶ء میں ہی ''مجھے تم سوچ کر دیکھو'' کے نام سے شعری مجموعہ منظر عام پر آیا۔ کم عمری میں شعری مجموعہ شائع ہوا لیکن اس کے ہاں فکر، پختہ نظر آتی ہے۔ ظہیرؔ احمد مغل کے مطابق:

''اس عمر میں ہر شخص زیادہ تر محبت کی باتیں کرتا ہے۔ لیکن احسنؔ سلیمان کی ایک خاص بات ہے۔ کہ اسے محبت کے ساتھ ساتھ اپنے وطن عزیز سے عشق ہے۔ جو اس کے اشعار اور اس کی نظموں میں نظر آتا ہے۔''۴۴

احسنؔ سلیمان کم عمر ہونے کے باوجود الفاظ کے استعمال میں بہت محتاط واقع ہوا ہے۔ وہ اس بات کی ہمیشہ کوشش کرتا ہے کہ اس کے کلام میں کوئی فنی سقم نہ رہ جائے۔ زبان و بیان کے حوالے سے بھی اس کی کوشش قابل قدر ہیں۔ احسنؔ سلیمان ابھی عمر کے اس حصے میں ہے جس میں عموماً فکری سطح کمزور ہوتی ہے۔ لیکن اس کے کلام سے بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک سنجیدہ تخلیق کار ہے۔ جو شاعری کو فرضِ اولین سمجھتا ہے اور پوری دل جمعی سے یہ کام کرتا ہے۔

احسنؔ سلیمان کی شاعری ابھی ارتقا کی ابتدائی سیڑھیوں پر ہے۔ اور اس بات کا قوی امکان ہے کہ وہ آنے والے وقت میں آزاد کشمیر کا ایک اہم شاعر بن جائے گا۔ احسنؔ وقت کے ساتھ ساتھ بہتر سے بہتر شاعری کر رہا ہے۔ احسنؔ کے

ہاں باغیانہ روش بھی اس کے خاص انداز کا حصہ ہے وہ اپنی دھرتی سے جنوں کی حد تک پیار کرتا ہے اور اس دھرتی کے لیے وہ ہر طرح کی قربانی دینے کے جذبے سے سرشار ہے۔ احسنؔ کی شاعری کے حوالے سے رانا توفیق صدیقی لکھتے ہیں:

''احسنؔ کی عمر کے اعتبار سے ان کی غزلیات بھی بہترین ہیں۔ ان غزلیات میں انھوں نے غزل کی روایت کو ملحوظ رکھا ہے۔ غزلیات احسن کو پڑھ کر قاری محسوس کرتا ہے کہ شاعر کو کسی بھی مقام پر قافیے اور ردیف کی کمی نہیں رہی۔ ان کی غزلیات واردات قلبی کے سادہ اور دل کش اظہار سے مزین ہیں۔ مجموعی طور ان کا کلام ان کے عمدہ تخیل اور جذبات واحساسات کا حسین مرقع ہے۔''۴۵

احسنؔ سلیمان کی شاعری میں سے چند مثالیں دیکھیں جن سے اس کے رنگ کا پتا چلتا ہے۔

مرے سینے میں اے لوگو مرے کشمیر کا غم ہے
مرے دل میں وطن تیری محبت شعلہ بنتی ہے

(احسن سلیمان، مجھے تم سوچ کر دیکھو، ص۳۴)

کہیں سنی، کہیں شیعہ، کہیں دیوبند کا جھگڑا
کہ میں نے فرقہ واریت کا وہ فتور دیکھا ہے

(احسن سلیمان، مجھے تم سوچ کر دیکھو، ص۳۷)

کسے خبر تھی کہ ہوں میں بھی عشق کا مارا
کہ ہم کو نیند نہیں رتجگوں نے لوٹا ہے

(احسن سلیمان، مجھے تم سوچ کر دیکھو، ص۷۵)

کچھ لوگ میرے شہر کے قارون تھے مگر
اچکا کے لے گئی انھیں اندھی عدم کہاں

(احسن سلیمان، مجھے تم سوچ کر دیکھو، ص۱۱۵)

ظہیر احمد مغل (۵ نومبر ۱۹۹۱ء) آزاد کشمیر کے ضلع حویلی میں جنم لینے والے ظہیر احمد مغل بھی شاعری میں سید شہباز گردیزی کے شاگرد ہوئے۔ ظہیر احمد مغل کے ہاں ادبی ذوق اس قدر ہے کہ وہ بیک وقت کئی ادبی تنظیموں سے وابستگی رکھے ہوئے ہیں۔ ظہیر مغل آزاد کشمیر کی معروف ادبی تنظیم ''طلوع ادب'' کے معتمد نشر واشاعت ہونے کے ساتھ ساتھ افکار پاکستان کے آزاد کشمیر ریجن کے معتمد بھی ہیں۔ ظہیر احمد مغل نے اردو شاعری میں خاص پہچان بنالی ہے وہ آزاد کشمیر کے ادبی حلقوں میں اپنے ادبی کارناموں کے باعث خاصے مقبول ہو رہے ہیں۔ نظم و غزل دونوں میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ ظہیر احمد مغل کا پہلا شعری مجموعہ ''میرا چاند'' کے نام سے زیر طبع ہے۔ ظہیر احمد مغل کی شاعری اپنے وقت کا نوحہ ہے وہ اپنے احساسات کو بڑے خوب صورت انداز میں شعری قالب میں ڈھالتے ہیں۔ ان کا کلام ملکی اخبارات و جرائد کی زینت بنتا رہتا ہے۔ ظہیر احمد مغل کے کلام سے کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

خواب جب ایڑھیاں رگڑتے ہیں
اشک آنکھوں سے بہہ نکلتے ہیں ۴۶

کبھی وہ یاد آجائے یا اس کا خواب آ جائے
کسی صورت بھی ہو وہ دو بدو تو شعر ہوتا ہے ۴۷

کیسے دیکھوں میں اسے جی بھر کے
جی ہے آخر یہ بھر بھی سکتا ہے ۴۸

ڈاکٹر ماجد محمود (ا جنوری ۱۹۸۰ء) کا تعلق آزاد کشمیر کے ضلع سدھنوتی کی تحصیل پلندری ہے۔ آپ کے والد محمد حنیف خود تو زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے لیکن انھوں نے اپنی اولاد کی بہترین تربیت کرتے ہوئے ان کو اعلیٰ تعلیم دلوائی۔

ڈاکٹر ماجد سدھن قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں یہ قبیلہ افغانستان کے قبائلی علاقوں سے برسوں پہلے آزاد کشمیر میں آ کر آباد ہوا۔

ڈاکٹر ماجد بچپن سے ہی بہت محنتی اور ذہین واقع ہوئے ہیں۔ اپنی شبانہ روز محنت کے باعث وہ اپنی ابتدائی جماعتوں میں ہمیشہ اول آتے۔ نصابی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ہم نصابی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔ ماجد

محمود زمانہ طالب علمی میں ایک اچھے مقرر کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ وہ متعدد دفعہ بڑی سطح کے تقریری مقابلوں میں اول انعام کے حق دار ٹھہرے۔

ماجدؔ محمود کی ابتدائی تعلیم پلندری سے ہی ہوئی بعد ازاں آزاد جموں وکشمیر یونی ورسٹی مظفر آباد سے بی ایس سی اور ایم ایس سی زوالوجی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ پیر مہر علی شاہ یونی ورسٹی راول پنڈی سے ۲۰۱۵ء میں ڈاکٹریٹ کرنے کے بعد پونچھ یونی ورسٹی، راولاکوٹ کے شعبہ زوالوجی میں بہ طور اسسٹنٹ پروفیسر خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

ڈاکٹر ماجدؔ اپنے زمانہ طالب علمی سے ہی شعری ذوق رکھتے تھے۔ اسی ذوق کی تسکین کے لیے پروفیسر عبدالعلیم صدیقی (مرحوم) کے باقاعدہ شاگرد ہوئے اور شعری رموز سیکھے۔ ڈاکٹر ماجدؔ نے شاعری کے ساتھ تنقید اور نثر میں بھی کسی حد تک کام کیا۔ یونی ورسٹی آف آزاد جموں وکشمیر میں کئی اسٹیج ڈرامے لکھے اور انعام کے حق دار ٹھہرے۔ ڈاکٹر ماجدؔ محمود کا کلام بے ساختہ اور سائنسی ادراک کا حامل ہونے کے ساتھ ساتھ زبان کے حوالے سے بھی خاصا اہم ہے۔ ڈاکٹر ماجدؔ کی اردو کی ادبی تاریخ پر بھی گہری نظر ہے۔ میرؔ، غالبؔ، داغؔ، فرازؔ تک سبھی شعرا کو شوق سے پڑھا جب کہ نثر میں مشتاق احمد یوسفی اور سعادت حسن منٹو کے مداح ہیں۔ ڈاکٹر ماجدؔ کی شاعری میں روایت کی واضح جھلک ملتی ہے۔ شوکت اقبال مصورؔ کے مطابق:

> ''ماجد کی شاعری اپنے عہد کی ایک صاف آواز بن گئی ہے۔
> وہ اپنے اردگرد کے حالات سے قطعی طور پر غافل نہیں۔
> اس کا کلام اپنے ہونے کا خود پتا دیتا ہے۔''۴۹

ڈاکٹر ماجدؔ محمود آزاد کشمیر کے نئے لکھنے والوں میں ایک نمایاں آواز ہے۔ ان کے اکثر اشعار مقبولیت حاصل کر چکے۔ ملکی اور ریاستی سطح پر جانے جانے والے ماجدؔ محمود کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ ان کا ایک شعر معروف غزل گو اور کالم نگار ظفرؔ اقبال نے اپنے کالم کا حصہ بنایا اور اسے پسندیدگی کا خلعت بخشا۔ ظفرؔ اقبال اپنے کالم بہ عنوان ''سرخی، متن، ٹوٹے، ڈاکٹر ضیا الحسن اور ماجد محمود ماجدؔ کے اختتام میں لکھتے ہیں۔

> ''اور اب چلتے چلتے پلندری سے ماجدؔ محمود کا یہ لاجواب شعر
> ہوس ہوتی تو پوری کر بھی لیتے
> محبت تھی ، ادھوری رہ گئی ہے'' ۵۰

ماجدؔ محمود نے غزل ہی کو اپنا ذریعہ اظہار بنایا اور اس میں نام کمایا۔ ماجدؔ محمود کی شاعری میں مزاج کی نرمی، حسن و عشق کے مضامین، زبان کی سادگی، روانی، برجستگی اور صاف گوئی جیسی خصوصیات موجود ہیں۔ وہ زمانے کی اونچ نیچ سے آگاہ ہیں اور ان ہی معاشرتی رویوں کو مضمون کرتے ہیں۔ ڈاکٹر ماجد محمود ماجدؔ کے چند اشعار بہ طور مثال دیکھیں۔

لوگ نہ جانے کیسی کیسی باتیں کرتے
تجھ سے بچھڑ کر فوراً مرنا ٹھیک نہیں تھا ۵۱

ممکن ہی کہاں ہ کہ کبھی تجھ کو بھلادوں
رہتی ہے ہمیشہ مجھے گھیرے تیری خوش بو ۵۲

اترنا پڑتا نہ پیغمبروں کو جنگوں میں
اگر سمجھتی یہ دنیا زباں محبت کی ۵۳

ظہورؔ منہاس (۱۵، مارچ ۱۹۹۶ء) آزاد کشمیر کے شعری ادب کا مستقبل نوجوان شاعر ظہورؔ منہاس کے صورت میں بھی روشن ہے۔ ظہورؔ منہاس کا پورا نام ظہورؔ اللہ منہاس ہے۔ ظہورؔ منہاس آزاد کشمیر کے ضلع مظفر آباد کے ایک خوب صورت گاؤں گلی کھیتر، بھیڑی میں پیدا ہوئے۔ ابتدا سے مطالعے کا شوق رہا تاہم ۲۰۱۴ء میں حصول معاش کے لیے باغ گئے جہاں سید شہبازؔ گردیزی اور ظہیرؔ احمد مغل کی صحبت میں مشق سخن جاری رکھی۔ ظہورؔ کے کلام میں نایاب ردیفیں اور اعلیٰ خیال اس کی خاص پہچان ہیں۔ ظہورؔ منہاس کے ہاں کئی ایسے اشعار ہیں جو آزاد کشمیر کے ادبی حلقوں میں مقبول ہو چکے ہیں۔ اس کے کلام میں سے چند اشعار ملاحظہ ہوں جو اس بات کی امکان ہیں کہ وہ کس قدر باصلاحیت تخلیق کار ہیں۔

ہزار حیف ہے کوفہ کی وادیوں تم پر
حسینؑ آنے سے پہلے ہی جل گئی ہوتیں ۵۴

میرؔ، کشمیراور میں خود بھی
درد کے مستند حوالے ہیں ۵۵

یہ کیا سادہ دلی تھی وصل میں جو
کلائی کی گھڑی کو روک رکھا ۵۲

بھیجی تصویر بھی تو آنکھوں کی
یعنی آنکھیں دکھا رہی ہو مجھے ۵۷

آصف اسحاق (۰۴،ستمبر ۱۹۸۰ء) کا تعلق بھی آزاد کشمیر کے ضلع سدھنوتی سے ہے۔ پروفیسر عبدالعلیم صدیقی (مرحوم) کے ہونہار شاگردوں میں شمار ہونے والے آصف اسحاق کے شعری ذوق کا پتا ان کا ہر ہر شعر دیتا ہے۔ایم۔اے اسلامیات کرنے کے بعد پرائیویٹ امیدوار کے طور پر جامعہ آزاد کشمیر سے ایم اے اردو کیا اور اب علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی سے ایم فل اردو کے لیے مقالہ لکھ رہے ہیں۔آصف اسحاق بزم فکر وسخن پلندری کے نہایت فعال کارکن ہیں اور باقاعدگی سے ادبی نشستیں انعقاد پذیر کرواتے ہیں۔آصف اسحاق کی شاعری بھی ان کے خوب صورت خیالات کا مجموعہ نظر آتی ہے۔ بہت کم لکھتے ہیں لیکن جو بھی لکھتے ہیں وہ سب انتخاب لگتا ہے۔آصف اسحاق کے لیے یہ اعزاز بھی کیا کم ہے؟ کہ ظفر اقبال نے ان کے ایک شعر پر ان کو اپنے کالم کے ذریعے داد دی۔۱۱جنوری ۲۰۱۷ء کے کالم میں ظفر اقبال نے لکھا۔

''آصف اسحاق کا پلندری سے یہ خوب صورت شعر موصول ہوا۔آپ بھی سنیئے

اب دکھائی نہیں دیتا کہ کہاں رکھا تھا
لوٹ آنے کے لیے ایک نشاں رکھا تھا

مطلب یہ کہ عمدہ شعر کہیں بھی اور کسی پر بھی اتر سکتا ہے۔ امید ہے موصوف اپنے کچھ اور اشعار بھی بھیجیں گے۔''۵۸

ظفر اقبال کا اعتراف بلاشبہ آزاد کشمیر کے اس شاعر کے لیے باعث فخر ہے۔آصف اسحاق کے کلام سے چند مزید اشعار دیکھیں:

اگر لوح و قلم آصف مجھ تفویض ہو جاتے
محبت کے قلم سے میں فقط تیری ثنا لکھتا ۵۹

کوئی آواز مقتل سے نکل کر
صدائے دہر ہوتی جارہی ہے ۶۰

اے مرے شاہ! ملاقات کے قابل ہو ں کہاں
مجھ کو جگما ہی کرو تم سردربار طلب ۶۱

جاوید سحر(۲۶، جون ۱۹۸۰ء) جن کا اصل نام جاوید اقبال ہے مقبوضہ کشمیر کے ضلع سوپور میں پیدا ہوئے۔نوے کے عشرے میں والدین کے ساتھ ہجرت کا دکھ اٹھایا اور آزاد کشمیر کے ضلع عباس پور میں سکونت اختیار کی۔جاوید سحر کا ایک گوجری مجموعہ ''گھر'' کے نام سے ۲۰۱۷ء میں شائع ہو چکا ہے جب کہ اردو شعری مجموعہ ''دستک'' زیر طبع ہے۔جاوید سحر نے اردو سے محبت کا ثبوت ایم اے اردو کر کے دیا۔جاوید کی شاعری بھی امکانات کی شاعری ہے۔ان کے کلام میں سے چند اشعار دیکھیں:

ہزار درپیش اب وجد اندگی پیارے
اگر یہ درد نہ ہوتے تو میں مر گیا ہوتا ۶۲

ان دنوں بے خطر ملو مجھ سے
ان دنوں پارسا نہیں ہوں میں ۶۳

ہمارے ہاتھ کی ریکھا میں صرف ہجرت ہے
ہمارے ساتھ سفر پر اگر گئے تو گئے ۶۴

احمد وقار(۷ اکتوبر،۱۹۸۶ء) کا تعلق آزاد کشمیر کے ضلع نیلم کے سرحدی گاؤں لیسوا سے ہے۔آپ کا پیدائشی نام وقار احمد میر ہے۔لیکن ادبی حلقوں میں احمد وقار کے نام سے جانے جاتے ہیں۔احمد وقار نے ابتدائی تعلیم لیسوا اور اٹھ مقام کے اداروں سے حاصل کی۔جامعہ کراچی سے معاشیات میں ماسٹر ڈگری حاصل کی۔آزاد کشمیر یونی ورسٹی مظفرآباد سے ایم

۔اے اردو کیا۔ احمد وقارؔ نے پی ایس سی کرنے کے بعد بہ طور لیکچرر اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا اس وقت وہ گورنمنٹ ڈگری کالج شاردہ میں لیکچرر معاشیات خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ احمد وقارؔ نے اپنی فطری صلاحیتوں کی بدولت شعروسخن سے بھی ناتا قائم رکھا ہے۔ علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی سے ایم فل اردو کے لیے مقالہ لکھنے والے احمد وقارؔ نے شعرائے نیلم کا ایک انتخاب ۲۰۱۴ء میں شائع کیا۔

احمد وقارؔ نے سنجیدہ شاعری کے ساتھ ساتھ مزاحیہ شاعری میں بھی خود کو منوایا ہے۔ ان کی شاعری حالات حاضرہ کے ساتھ ساتھ معاشرتی ناہمواریوں کے گرد گھومتی ہے جیسا کہ پروفیسر فرزانہ ناز رقم طراز ہیں:

''سماجی ومعاشرتی مسائل وناہمواریاں بھی ان کی نظر میں ہیں۔ محبوب سے اظہار محبت اور بے التفاتی کو مزاح کی چاشنی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔'' ۶۵

احمد وقارؔ ضلع نیلم کے اچھی شہرت کے حامل شاعر ہیں جن کا اوڑھنا، بچھونا ادب ہی ہے۔ گھر میں ایک ضخیم لائبریری اس بات کا ثبوت ہے۔ مشتاق احمد یوسفی سے عقیدت کی حد تک محبت ہے۔ شاعری میں احمد فرازؔ، اقبالؔ، فیضؔ، اور غالبؔ ان کے پسندیدہ شعرا ہیں تاہم عصر حاضر کے نوجوانوں کا کلام بھی ان کے زیر مطالعہ رہتا ہے۔ احمد وقارؔ کے کلام میں سے چند اشعار بہ طور نمونہ دیکھیے۔

دیکھ لو موت تلک ساتھ نبھایا ہے وقارؔ
بھری دنیا میں ترا غم ہی ہمارا نکلا ۶۶

صحرا بھی چھن گئے ہیں سرابوں کے ساتھ ساتھ
آنکھیں بھی لے گیا ہے وہ خوابوں کے ساتھ ساتھ ۶۷

آب دینے کی ضرورت نہ رہی قاتل کو
تیغِ ابرو کے لیے میرا لہو کافی ہے ۶۸

پروفیسر اعجازؔ نعمانی (۱۲، مارچ ۱۹۶۹ء) کا اصل نام اعجاز احمد ہے۔ شبلی نعمانی کی نسبت سے نعمانی کا لاحقہ لگا کر

اعجاز نعمانی کہلائے۔اعجاز نعمانی آزاد کشمیر کے شعری منظر نامے میں نمایاں نام ہے۔غزل سے عشق کی حد تک لگاؤ ہے۔ اعجاز نعمانی نے ابتدائی تعلیم اپنے آبائی گاؤں چکار سے حاصل کی۔اپنے خالہ زاد پروفیسر ڈاکٹر افتخار مغل سے اکتساب فیض حاصل کیا اور ابتدائی عمر سے ہی شعر موزوں کہنے لگے۔اعجاز نعمانی نے ایم اے اردو آزاد جموں وکشمیر یونی ورسٹی سے کرنے کے بعد محکمہ تعلیم میں ملازمت سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔اس وقت گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج مظفر آباد میں تدریسی فرائض ادا کر رہے ہیں۔اعجاز نعمانی علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی سے ایم فل کی ڈگری کے لیے مقالہ بھی لکھ رہے ہیں۔

آزاد کشمیر کے ادبی ماحول کو اعجاز نعمانی نے خوب جلا بخشی ہے۔آزاد کشمیر کی اہم ادبی تنظیم کشمیر لٹریری سوسائٹی جس کا موجود نام کشمیر لٹریری سرکل ہے کے بانی سیکرٹری ہیں اور تا حال اس عہدے پر خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔کشمیر لٹریری سرکل آزاد کشمیر کی ایک فعال تنظیم ہے جو ادب کی ترقی و ترویج کے لیے۱۹۹۳ء سے خدمات فراہم کر رہی ہے۔اکادمی ادبیات آف پاکستان کے آزاد کشمیر میں فوکل پرسن کے طور پر بھی اعجاز نعمانی کی خدمات لائق تحسین ہیں۔ادبی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔۱۹۹۵ء سے ملکی سطح کے تمام بڑے رسائل و جرائد میں ان کا کلام باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔اعجاز نعمانی گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج مظفر آباد کے مجلّے ''دومیل'' کے چیف ایڈیٹر کے طور پر بھی خدمات بہم پہنچا رہے ہیں۔جب کہ ان کے ادبی کالم ملکی سطح کے اکثر اخبارات میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔پروفیسر اعجاز نعمانی جہاں ادب کے لیے اپنی خدمات سے بھی بھی گریزاں نظر نہیں آتے وہیں اپنے مجموعے کی اشاعت میں خاصے محتاط واقع ہوئے ہیں۔آپ کا اولین شعری مجموعہ ''کہے بغیر'' کے نام سے اشاعت کے آخر مراحل میں ہے تاہم آپ کا شعری انتخاب ''اس گلی میں ہے بیل پھولوں کی'' کے نام سے ۲۰۰۴ء میں اشاعت پذیر ہو چکا ہے۔اعجاز نعمانی کے کلام سے ان کی شاعری کے چند نمونے ملاحظہ ہوں:

چاہے چھلنی ہو یہ مشکیزہ کہ پانی جائے
جبر والوں سے مگر ہار نہ مانی جائے ۶۹

حسن اور اتنی فراوانی کے ساتھ
دیکھتا رہتا ہوں حیرانی کے ساتھ ۶۰

میں کیسے زندہ و مردہ میں امتیاز کروں
بنے ہیں قبروں پہ اعجاؔز گھر زیادہ تر ۷۱

اعجاؔز نعمانی کی شاعری موجودہ عہد میں ہوا کے ایک تازہ جھونکے کی مانند ہے جو قاری کو فرحت اور تسکین کی سر شاری عطا کرتی ہے۔ایم یاسؔین کے مطابق:

''ان کی غزل میں گاؤں کی اداسی،شام کے اسرار اور صبح کے نور کے بھیگے ہوئے پھولوں کی شبنمی تازگی باہم آمیخت ہوگئے ہیں۔''۷۲

شوزیب کاشؔر (۱۱نومبر،۱۹۸۶ء) کا اصل نام شوزیب صادق ہے۔آپ کا تعلق وادی پرل راولاکوٹ کے گاؤں بھیکھ سے ہے۔شوزیب کاشؔر جب دسویں جماعت میں تھے تو اس وقت انھوں نے پہلا شعر کہا۔

شوزیب کاشر کا پہلا مجموعہ۲۰۰۲ء میں ''میں نے پیار بیچ دیا'' کے نام سے منظر عام پر آیا۔اس وقت شوزیب کاشؔر صرف ۱۵پندرہ برس کے تھے۔۲۰۰۴ء میں نیشنل چلڈرن ڈے پر اسلام آباد کی نیشنل لائبریری میں مذکورہ مجموعے کے لیے کم سِن صاحبِ کتاب ہونے پر شوزیب کاشؔر طلائی تمغے اور سندِ اعزاز کے حق دار ٹھہرے۔حکومت پاکستان کے جانب سے یہ اعزاز پا کر ان کے حوصلے مزید بڑھ گئے جس کا ثبوت ۲۰۰۶ء میں ''نوائے خضر'' کی اشاعت ہے۔اس کے علاوہ شوزیب کاشر کے زیرِ طبع مجموعوں میں ''مسیحائی''اور'' مجھے راستے میں نہ چھوڑنا'' جلد اشاعت پذیر ہو جائیں گے۔

شوزیب کاشؔر غزل کے ساتھ ساتھ آزاد کشمیر میں نعت نگاری کے حوالے سے ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔اللہ پاک نے ان کو کلام کے ساتھ ساتھ آواز کی دولت سے بھی مالا مال کیا ہے جب ترنم سے پڑھتے ہیں تو محفل میں سکوت طاری ہو جاتا ہے اور محفل زعفران زار ہو جاتی ہے۔شوزیب کاشؔر غزل کے داخلی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ اس کے خارج پر بھی دھیان دیتے ہیں۔عربی اور فارسی سے آشنائی نے ان کی شاعری میں مزید نکھار پیدا کر دیا ہے۔شوزیب کاشؔر آزاد کشمیر کے شعری ادب میں ایک معتبر حوالہ بن چکے ہیں۔ان کا کلام محافل کی زینت بن چکا ہے اور ان کے بنا کوئی ادبی محفل ادھوری تصور کی جاتی ہے۔شوزیب کاشؔر کے کلام میں سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

کن کہوں اور کم ہو جائیں
آدمی ہو کوئی خدا ہوں کیا ۷۳

مرے نبی ﷺ نے دی سدا دشمن جان کو بھی اماں
بدلے کی آگ پالنا میری سرشت میں نہیں ۷۴

زندگی بھوک کے ماروں کی نہ پوچھو کاشرؔ
غم کی سولی پہ یہ ہر روز لٹک جاتی ہے ۷۵

فاروق حسین صابرؔ (۱۰ جون، ۱۹۶۵ء) کا تعلق بھی آزاد کشمیر کے ضلع راولاکوٹ سے ہے۔ ایم۔اے عربی اور ایم اے اسلامیات تک کی تعلیم حاصل کی۔ درس و تدریس کے شعبے سے وابستہ ہیں۔ فاروق صابرؔ چوں کہ ایک مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے بن جونسہ کی جامع مسجد میں خطیب کی ذمہ داری بھی آپ نبھا رہے ہیں۔ آپ کے کلام میں معاشرے کے حساس پہلوؤں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ فاروق صابرؔ کسی محفل میں ہوں تو ان کا ترنم محفل میں ایک سحر کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ فاروق صابرؔ کا مجموعہ تا حال شائع نہیں ہو سکا تاہم وہ کئی رسائل اور شعری انتخابات میں شائع ہو چکے ہیں۔ فاروق صابرؔ کے کلام کے نمونے دیکھیں:

دیواریں ملی ہیں ہر گھی کی پھر بھی ہیں جدا دل آپس میں
اس شہر میں ہر اک تنہا ہے یوں لوگ ہزاروں رہتے ہیں ۷۶

امیر شہر نے قبضہ کیا سب کے وسائل پر
خطیب اپنی خطابت میں اس کا حق بتاتے ہیں ۷۷

غلامی سے نکلتے ہیں زمانے ہیں وہی صابرؔ
شعور و آگہی کے جو دیے پیہم جلاتے ہیں ۷۸

حوالہ جات

۱۔ وارث سرہندی (مرتبہ)، علمی اردو لغت، علمی کتب خانہ، لاہور، س، ن، ص ۴۸۷۔

۲۔ عبدالحفیظ بلیاوی، ابوالفضل، مولانا، مصباح اللغات، ادارۃ العلم، نوشہرہ، جون ۲۰۱۴ء، ص ۵۹۸۔

۳۔ حامد حسن قادری، تاریخ وتنقید، لکشمی نارائن اگروال پبلشرز، آگرہ، طبع دوم ۱۹۴۷ء، ص ۱۰۱۔

۴۔ رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، اصنافِ ادب، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص ۳۱۔

۵۔ محمود شیرانی، حافظ، مقالاتِ محمود شیرانی، مظہر محمود شیرانی (مرتبہ)، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۹ء، ص ۴۸۔

۶۔ پریم ناتھ بزاز، پنڈت، تاریخِ جدوجہد آزادیٔ کشمیر، عبدالحمید نظامی (مترجم)، ویری ناگ
پبلشرز، میرپور، ۱۹۹۲ء، ص ۲۲۹۔

۷۔ حبیب کیفوی، کشمیر میں اردو، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۱۹۷۹ء، ص ۱۷۔

۸۔ محمد صغیر آسی، پروفیسر، شعرائے کشمیر، الفضل کتاب گھر، میرپور، اپریل ۱۹۹۳ء، ص ۱۰۴۔

۹۔ ایضاً، ص ۱۰۵۔

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۰۶۔

۱۱۔ ایضاً، ص ۳۷۲۔

۱۲۔ ایضاً، ص ۳۷۴۔

۱۳۔ ایضاً۔

۱۴۔ ایضاً۔

۱۵۔ ایضاً۔

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۸۱۔

۱۷۔ مقالہ نگار کا رانا غلام سرور سے انٹرویو، بہ ذریعہ ٹیلی فون، ۲۱، نومبر، ۲۰۱۶ء،

۱۸۔ افتخار مغل (دیباچہ) قرضِ سخن، نذیر انجم، ارشد بک سیلرز، میرپور، س، ن، ص ۱۵۔

۱۹۔ قدرت اللہ شہاب (فلیپ)، قرضِ سخن، نذیر انجم، ارشد بک سیلرز، میرپور، ۔

۲۰۔ شہباز گردیزی، اجلی مٹی (انتخاب)،نکس پبلشرز، میر پور، مارچ ۲۰۱۵ء، ص۱۶۔

۲۱۔ ایضاً۔

۲۲۔ ایضاً، ص۱۷۔

۲۳۔ ایضاً، ص۱۸۔

۲۴۔ ایضاً، ص۱۹۔

۲۵۔ ایضاً، ص۲۶۔

۲۶۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر (دیباچہ)،صلیبوں کا شہر،مخلص وجدانی، ادبیات، مظفرآباد، س۔ن، ص۴۔

۲۷۔ جگن ناتھ آزاد (دیباچہ)،صلیبوں کا شہر،مخلص وجدانی، ادبیات، مظفرآباد، س، ن، ص۵۔

۲۸۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر (پیش لفظ)،صلیبوں کا شہر،مخلص وجدانی، ادبیات، مظفرآباد، ص۷۔

۲۹۔ لیاقت شعلان کا مقالہ نگار کے نام خط، بہ تاریخ ۲۵، نومبر، ۲۰۱۶ء۔

۳۰۔ ایضاً۔

۳۱۔ ایضاً۔

۳۲۔ ایضاً۔

۳۳۔ جواد جعفری (پیش لفظ)، احتجاج، ادارہ تحقیقاتِ اسلامی، مظفرآباد، جون ۱۹۹۴ء، ص۵۔

۳۴۔ سحر انصاری، ایک کہنہ مشق شاعر (دیباچہ)، ہم سخن، ناز مظفرآبادی، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۵ء، ص۱۷۔

۳۵۔ محمد اظہار الحق، شاعرِ خوش امکان (دیباچہ)، خاموشی کی کھڑکی سے، زکریا شاز، زریون مطبوعات، فیصل آباد، نومبر ۲۰۱۳ء، ص۱۷۔

۳۶۔ وزیر آغا، ڈاکٹر (فلیپ) خاموشی کی کھڑکی سے، زکریا شاز، زریون مطبوعات، فیصل آباد، نومبر ۲۰۱۳ء۔

۳۷۔ افتخار مغل، ڈاکٹر، پروفیسر (فلیپ)، خواب کون دیکھے گا، سید شہباز گردیزی، طلوع پبلی کیشنز، باغ، دسمبر ۲۰۰۸ء۔

۳۸۔ ظفر اقبال، شہسوارِ سخن (دیباچہ)، ہمیشہ، احمد عطاء اللہ، ص۱۷۔

۳۹۔ شہباز گردیزی، سید (دیباچہ)، جھیل کا چاند، الطاف عاطف، مہلب پبلی کیشنز ہاؤس، پسنی، ۲۰۱۲ء۔ ص۱۵۔

۴۰۔ زاہد کلیم (دیباچہ)، لمحات نشتر، نیلم پبلی کیشنز، مظفر آباد، نومبر ۲۰۰۲ء، ص ۱۶۔

۴۱۔ مقالہ نگار کا زاہد کلیم سے انٹرویو، ۱۲ نومبر ۲۰۱۶ء، بہ مقام ریڈیو سٹیشن مظفر آباد۔

۴۲۔ مقصود جعفری، ڈاکٹر، ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب سے (دیباچہ)، نئے اُجالے ہیں خواب میرے، اکرم سہیل، جمہوری پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۱۱۔

۴۳۔ عبدالعلیم صدیقی، پروفیسر (دیباچہ) میں حرف حرف سمیٹوں، شفیق راجا، طلوع پبلی کیشنز، باغ، ستمبر ۲۰۰۳ء، ص ۹۔

۴۴۔ ظہیر احمد مغل، احسن کا پہلا قدم (دیباچہ)، مجھے تم سوچ کر دیکھو، احسن سلیمان، حویلی پبلیشنگ ہاؤس، کہوٹہ، ستمبر ۲۰۱۶ء، ص ۱۵۔

۴۵۔ توفیق صدیقی، رانا، احسن کا احسن قدم، مشمولہ روزنامہ جناح، اسلام آباد، ۱۹، جنوری ۲۰۱۷ء،

۴۶۔ شہباز گردیزی، سید، اُجلی مٹی (انتخاب)، نکس پبلیشرز، میر پور، مارچ ۲۰۱۵ء، ص ۱۳۷۔

۴۷۔ ایضاً، ص ۱۳۸۔

۴۸۔ ایضاً، ص ۱۳۹۔

۴۹۔ مقالہ نگار کا شوکت اقبال سے انٹرویو، بہ تاریخ ۱۶ دسمبر ۲۰۱۶ء، بہ مقام چھتر دومیل۔

۵۰۔ ظفر اقبال، دال دلیہ، مشمولہ روزنامہ دنیا، لاہور، ۲۱ ستمبر ۲۰۱۶ء۔

۵۱۔ ڈاکٹر ماجد محمود ماجد کا خط بہ نام مقالہ نگار، ۱۳ جنوری ۲۰۱۷ء۔

۵۲۔ ایضاً۔

۵۳۔ ایضاً۔

۵۴۔ ظہور منہاس کا خط بہ نام مقالہ نگار، ۲۱ جنوری ۲۰۱۷ء۔

۵۵۔ ایضاً۔

۵۶۔ ایضاً۔

۵۷۔ ایضاً۔

۵۸۔ ظفر اقبال، دال دلیہ، مشمولہ روزنامہ دنیا، لاہور، ۱۱ جنوری ۲۰۱۷ء۔

۵۹۔ شہباز گردیزی، سید، اُجلی مٹی (انتخاب)، نکس پبلیشرز، میر پور، مارچ ۲۰۱۵ء، ص ۵۵۔

۶۰۔ ایضاً، ص ۵۶۔

۶۱۔ ایضاً، ص ۵۷۔

۶۲۔ ایضاً، ص ۷۷۔

۶۳۔ جاوید سحر کا خط بہ نام مقالہ نگار، ۰۳ جولائی ۲۰۱۷ء۔

۶۴۔ ایضاً۔

۶۵۔ فرزانہ ناز، پروفیسر، آزاد کشمیر میں طنز و مزاح، علی پرنٹرز، میر پور، ۲۰۱۴ء، ص ۲۷۳۔

۶۶۔ احمد وقار (مرتبہ)، کہکشاں، نکس پبلی کیشنز، میر پور، ۲۰۱۴، ص ۳۴۔

۶۷۔ ایضاً، ص ۳۵۔

۶۸۔ ایضاً، ص ۳۷۔

۶۹۔ اعجاز نعمانی (مرتبہ)، اس گلی میں ہے بیل پھولوں کی، الرزاق پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۱۰۵۔

۷۰۔ ایضاً، ص ۱۰۷۔

۷۱۔ ایضاً، ص ۱۱۴۔

۷۲۔ ایضاً، ص ۱۱۷۔

۷۳۔ شوزیب کاشر کا خط بہ نام مقالہ نگار، ۲۳ اکتوبر ۲۰۱۶ء۔

۷۴۔ ایضاً۔

۷۵۔ ایضاً۔

۷۶۔ شہباز گردیزی، سید، اُجلی مٹی (انتخاب)، نکس پبلیشرز، میر پور، مارچ ۲۰۱۵ء، ص ۱۵۶۔

۷۷۔ ایضاً، ص ۱۵۸۔

۷۸۔ ایضاً، ص ۱۵۹۔

باب دوم

آزاد کشمیر کے منتخب غزل گو شعرا (۱۹۷۰ء تا ۲۰۰۰ء)

الطافؔ قریشی:۔

مختصر حالات زندگی

الطافؔ قریشی عرب خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ خاندان اسدی ہاشمی قریشی ہے جس کا سلسلہ نسب حضرت ہاشم بن عبدالمناف سے جا ملتا ہے۔ الطافؔ قریشی کے بھائی منظور ہاشمی کے مطابق:

''ہمارے جدامجد حضرت میاں محمد محسن کا وطن مولود بخارا تھا۔ راجا مظفر خان کے عہدِ حکومت میں ہمارے مورث اعلیٰ کشمیر آئے اور مظفر آباد میں سنڈھ گلی محلّہ میں قیام کیا۔''۱

سنڈھ گلی مظفر آباد کے عین وسط میں سری نگر روڈ کے دائیں کنارے ایک معروف بستی ہے۔ اس بستی میں ۱۳ نومبر ۱۹۳۷ء کو ایک بہن مختار بیگم اور بھائی نذیر حسین کے بعد الطافؔ قریشی کا جنم ہوا۔ آپ کا خاندان علمی و ادبی تھا۔ بڑے بھائی نذیر حسین بھی مدرس ہوئے یہی وجہ تھی کہ پہلی درس گاہ گھر میں ہی میسر آئی۔ نصابی تعلیم گورنمنٹ پائلٹ ہائی اسکول مظفر آباد سے حاصل کی جس کا موجودہ نام غلام محمد راتھر گورنمنٹ ہائی اسکول ہے۔ مڈل کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیا اور وظیفہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ یہ الطافؔ قریشی کی زندگی کی پہلی بڑی کامیابی تھی۔ یہاں سے آگے ان کے لیے منزلیں ساز گار ہوتی چلی گئیں اور مشکلات دور ہوتی چلی گئیں۔ آٹھویں جماعت میں الطافؔ قریشی کی پہلی تخلیق ایک افسانے کی صورت میں سامنے آئی۔ یہ افسانہ ''آہ وغریب'' کے عنوان سے راول پنڈی کے ہفت روزہ ''آغاز'' میں شائع ہوا۔

۱۹۵۴ء میں میٹرک پاس کرنے کے بعد الطافؔ قریشی گورنمنٹ انٹر کالج مظفر آباد میں داخل ہوئے۔ یہاں ان کو مزید آگے بڑھنے کے مواقع ملے جن سے ان کی صلاحتیں نکھر کر سامنے آئیں۔ گورنمنٹ انٹر کالج ہی کے پلیٹ فارم سے آپ نے ''بہترین مقرر'' اور ''بہترین شاعر'' کی اسناد حاصل کیں۔ الطافؔ قریشی کی علمی و ادبی سرگرمیوں کے اعتراف میں ان کو کالج سے شائع ہونے والے مجلّے ''دومیل'' کا مدیر بنا دیا گیا۔ الطافؔ قریشی کی ادارت میں شائع ہونے والا یہ مجلّہ آزاد کشمیر کے تعلیمی اداروں کے علمی و ادبی مجلوں میں نمایاں مقام حاصل کر چکا تھا۔ ۱۹۵۶ء میں اس کے مدیر نے

انٹرمیڈیٹ کاامتحان دیا جب نتائج سامنے آئے تو ''دومیل'' کے مدیر الطاف قریشی نے اول پوزیشن حاصل کی۔ انٹرمیڈیٹ کے بعد مزید تعلیم کے حصول کے لیے میرپور شہر کا رُخ کیا جہاں ڈگری کالج میں الطاف قریشی کی فکری و ذہنی سطح کو اوج ملا۔ ڈگری کالج میرپور میں نوجوان الطاف قریشی نے ادب کی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ یہاں انھوں نے شاعری کے علاوہ ڈراما نگاری اور اداکاری میں بھی نام پیدا کیا۔ جس کا ثبوت آپ کو ملنے والے وہ اعزازات ہیں جو اس دور کی یادگار ہیں۔ اس ادارے میں بھی آپ کی قابلیت کو پرکھتے ہوئے کالج میگزین ''سروش'' کا مدیر بنادیا گیا۔ پروفیسر اکرم طاہر اس وقت آپ کے استاد تھے جن کی سرپرستی آپ کے لیے سودمند ثابت ہوئی۔ گریجویشن میں الطاف قریشی اپنی پوزیشن کا دفاع کرنے میں ناکام رہے اور ایک نمبر کے فرق سے دوسری پوزیشن حاصل کی۔

۱۹۵۹ء میں بی اے پاس کرنے کے بعد سرکاری ملازمت کی طرف آ گئے۔ اولین تقرری بہ طور لائبریرین گورنمنٹ کالج مظفرآباد میں ہوئی۔ آپ کی وہ درس گاہ جس سے آپ نے تعلیم حاصل کی اب آپ کے لیے معاش کا ذریعہ بن گئی۔ ۱۹۶۰ء میں پبلک سروس کمیشن کا امتحان پاس کرنے کے بعد محکمہ لوکل گورنمنٹ میں (PRO) پبلک ریلیشنز آفیسر تعینات ہوئے۔ علم و فن کے اس پروانے کے لیے یہ ملازمت آسودگی کا باعث نہ ٹھہری۔ لہذا ۱۹۶۲ء میں پاکستان براڈ کاسٹنگ کارپوریشن میں ملازمت اختیار کی اور آزاد کشمیر ریڈیو مظفرآباد میں پروگرام پروڈیوسر تعینات ہوئے۔ اس جگہ کچھ وقت گزارنے کے بعد سینئر پروگرام پروڈیوسر کے طور پر راول پنڈی تبادلہ ہوگیا۔ جہاں سے ۱۹۷۱ء میں ملتان سے اسی عہدے پر تبادلہ ہوگیا۔ اس عرصے میں مشرقی پاکستان الگ ہوا تھا الطاف قریشی کا ایک مشہور گیت ناہید اختر نے گا کر لازوال کر دیا جس کے بول تھے۔

تارا تارا جوڑ کے لوگو پھر ایک چاند بناؤ

اس گیت کے حوالے سے راجا شوکت اقبال کہتے ہیں۔

''ملتان میں تعیناتی کا یہ عرصہ الطاف قریشی کے لیے جہاں ایک دکھ اور کرب کا باعث بنا کہ ملک دولخت ہوا وہیں یہ بات اس کے لیے حوصلہ افزا بھی تھی کہ ناہید اختر کی آواز میں اس کا پیغام ملک کے طول و عرض میں پہنچا جس سے اس کی شہرت اور مقبولیت کا ایک اور در وا ہوا۔''[۲]

الطافؔ قریشی کی شہرت کو شاید کسی کی نظر لگ گئی کہ ۱۹۷۵ء میں ان کو دل کا دورہ پڑا۔ جس نے ان کو کم زور بنا دیا۔ ۱۹۷۸ء میں دوبارہ دل کا دورہ پڑا لیکن ابھی آپ کی زندگی باقی تھی۔ ۱۹۹۵ء میں تیسری مرتبہ جب دل کا دورہ پڑا تو آپ اس کو برداشت نہ کر پائے اور دارفانی سے ہمیشہ کے لیے منہ موڑ لیا۔

الطاف قریشی نے کم عمری میں انتقال کیا لیکن ادب کے لیے گراں قدر سرمایہ چھوڑ گئے۔ ان کی مطبوعہ و غیر مطبوعہ تصانیف کی تعداد قریباً آٹھ ہے۔ جن میں ''داتا زہر پلا''، ''ثنا''، ''اکھیاں دے پر چھاویں'' ''شہر زندگی'' مطبوعہ ہیں جب کہ، ''شناخت''، ''داتا تیرے دوارے''، ''شہرِ تمثیل''، ''تارا کلس''، غیر مطبوعہ ہیں۔

کئی کتابوں پر ''پاکستان رائٹرز گلڈ ایوارڈ''، صدارتی ایوارڈ'' سمیت کئی اہم ایوارڈز بھی مل چکے ہیں۔

فنی جائزہ:۔

الطافؔ قریشی نے یوں تو نظم، غزل، ڈراما، ناول سمیت کئی اصناف میں طبع آزمائی کی لیکن ہم یہاں الطافؔ قریشی کی غزل کا جائزہ لیں گے۔ ان کی شاعری میں غزل ایک الگ شناخت بنی، ''داتا زہریلا''، ''شہر زندگی''، ''داتا تیرے دوارے''، ''ثنا'' ان کی شاعری کے مجموعے ہیں۔ اکثر غزلیں غیر مطبوعہ حالت میں موجود ہیں۔ الطافؔ قریشی کے اندر جو خداداد صلاحیتیں موجود تھیں انہی کی بدولت ان کو وہ مقام حاصل ہوا جو بہت کم لوگوں کے حصے میں آتا ہے۔ الطافؔ قریشی نے جس دور میں شاعری کی وہ جدید غزل کا مقبول دور ہے۔ جس میں احمد ندیمؔ قاسمی، احمد فرازؔ، منیؔر نیازی، ناصرؔ کاظمی، غلام محمد قاصرؔ جیسے شعرا کا شہرہ تھا۔ ایسے حالات میں اپنے آپ کو منوانا یقیناً آسان نہیں تھا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اس دور میں غزل ایک طویل مسافت طے کر چکی تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کے موضوعات و رجحانات میں بھی تبدیلی آ چکی تھی۔ الطافؔ قریشی جس علاقے (مظفر آباد) سے تعلق رکھتے تھے اس وقت یہاں بھی اُردو غزل کہنے والوں کی تعداد انگلیوں کی پوروں پر گنی جا سکتی ہے۔ ان کے حلقہ احباب میں احمد شمیمؔ، منوں بھائی، منیؔر نیازی، آزرؔ عسکری، وغیرہ بھی نظم کی طرف مائل تھے۔ راجا شوکت اقبالؔ کے مطابق:

> ''جس وقت الطافؔ قریشی نے غزل کو ذریعہ اظہار بنایا اس وقت مظفر آباد میں غزل کا چلن کم تھا۔''۳

غزل کے اندر دم مارنا ایک دقیق اور مشکل کام ہے کیوں کہ غزل نسبتاً ایک مشکل صنف ہے۔ نظم کی نسبت اس کے

اندر طبع آزمائی کرنے والے بہت ہیں لیکن اس کے ساتھ انصاف کرنے والے بہت کم۔ الطافؔ قریشی نے بھی نظموں کی بہ نسبت غزل کی طرف کم رخ کیا۔لیکن جو غزلیں کہیں وہ انتخاب کہلائی ہیں۔

علامات کا استعمال:

الطافؔ قریشی کے غزل سے ان کے موضوعاتی پھیلاؤ کا واضح پتا ملتا ہے۔ہم دیکھتے ہیں کہ غزل کے سرمائے میں بھی ان کی وہ رنگا رنگی، تنوع اور وسعت موجود ہے جو نظم میں ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان کی غزل میں موت کا خوف، زندگی سے محبت، دوہرے رویے، نفسیاتی مسائل کا شعور، شہرِ آرزو کی تمنا، وطنِ عزیز کی غلامی کا احساس اپنے ہونے کے امکانات اپنے فکری و ذہنی حسن، اپنی اٹھان اور صلاحیتوں کا احساس، فطرت کے قریب رہنا اور انسانیت کا پرچار سمیت کئی دیگر موضوعات ملتے ہیں۔

تو اثاثہ ہے اپنے گاؤں کا
خود کو شہروں میں مت لٹا جانا

(الطاف قریشی، شہر زندگی، ص ۱۷)

قید سے یہ سانس کا پنچھی رہا ہوجائے گا
دیکھ لینا ایک دن میرا کہا ہو جائے گا

(الطاف قریشی، شہر زندگی، ص ۲۳)

الطافؔ قریشی کے ہاں جدید علامات کا استعمال بھی ان کی انفرادیت کا پتا دیتا ہے۔ روایتی علامات کے استعمال کے ساتھ ساتھ انھوں نے جو مخصوص علامات استعمال کی ہیں ان کا شاعر کے معاشرے اور اس کی زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ اُردو ادب میں علامات کا یہ چلن غالبؔ اً اقبالؔ سے رواج پایا۔ اقبالؔ کے بعد نظم و نثر میں کئی مختلف شکلوں میں یہ علامات ادب کی خوب صورتی میں اضافے کا باعث بنیں۔ الطافؔ قریشی کے ہاں بٹیر، پرندے، سائے، روشنی، ڈھلوان، گاؤں، شہر، آنسو، ہوا اور دستک وغیرہ ایسی علامات ہیں جو ان کے کلام میں جا بہ جا دکھائی دیتی ہیں۔ شجر اور پرندے بہ طور علامات الطافؔ قریشی کے ہاں اکثر جگہ ملتے ہیں۔ یہ علامات زندگی، آزادی اور بستی کے مضمون میں استعمال کیے گئے ہیں۔

علامات فن کے اظہار کا جہاں وسیلہ ثابت ہوتی ہیں وہیں ان سے کلام میں حسن و جدت بھی پیدا ہوتی ہے۔ اکثر

علامات تو خود فن کار کی زندگی کا احاطہ کرتی ہیں۔ پرندے، ہجرت سے عبارت ہیں۔ چوں کہ پرندے کسی ایک مقام پر بسیرا نہیں کرتے بل کہ اکثر ٹھکانا بدلتے رہتے ہیں اسی وجہ سے شاعری میں ان کو ہجرت کی علامت بنا دیا گیا ہے۔ ہجرت بھی دکھ درد دیتی ہے۔ پرندوں کو بھی کسی نہ کسی مشکل کی وجہ سے ٹھکانے بدلنے پڑتے ہیں۔ الطافؔ قریشی کے ہاں استعمال ہونے والی ایک اور علامت ''دستک'' بھی ان کی زندگی سے خاصی قربت رکھتی ہے۔ الطافؔ قریشی کا تعلق ایک ایسی قوم سے ہے جو تمام عمر اپنی آزادی اور حقوق کے لیے دُنیا کے مصنفوں کے در پر دستک دیتی رہی ہے۔ وہ اپنی اس دھرتی کو آزاد دیکھنے کے خواہش مند ہیں جو دشمن کے نرغے میں ہے۔ وہ اپنے کلام کے ذریعے ان انسانوں کے ضمیروں کو دستک دے کر جھنجھوڑنا چاہتے ہیں جو سب کچھ سمجھنے اور جاننے کے بعد بھی آنکھیں موندھے بیٹھے ہیں۔ ایسے لوگوں کو الطافؔ قریشی مردہ مانتے ہیں۔ مثال دیکھئے۔

اس شہر میں دستک پہ کوئی در نہ کھلے گا
یہ شہر تو اب قبر کے اندر کی طرح ہے

(الطاف قریشی، شہر زندگی، ص۳۹)

ایسے ہی الطافؔ قریشی کے ہاں سناٹے کی علامات کہیں بھوت اور کہیں جبریت کے خلاف آواز بلند کرتے نظر آتے ہیں۔ جبریت کی ہی علامت الطافؔ قریشی کے ہاں قومی آہنگی سے گہرے تعلق کو ظاہر کرتی ہے۔ ''خوش بو'' کی علامت ہمیں اُردو شاعری میں جا بہ جا نظر آتی ہے۔ الطافؔ قریشی کے ہاں بھی یہ علامت اپنے پورے ذوق وشوق کے ساتھ موجود ہے۔ اس کی شاعری میں ''خوش بو'' محبت اور انسانی معاشرے سے لگاؤ کی علامت ہے۔ وہ محبت کو انسانوں میں بانٹنے کے قائل ہیں اور دردِ دل رکھنے والے انسان ہیں۔ وہ اپنی ذات کے حصار میں نہیں بند بل کہ اپنی ذات کی خوش بو کو چار سو پھیلانے کے عادی ہیں۔ الطافؔ قریشی کی شاعری ہی گاؤں کی علامت عافیت اور رشتوں کے جذباتی احساس کو سامنے لاتی ہے۔

ایک علامت شہرِ جدید جو کہ صنعتی رویوں، اقدار کی کمی، تباہی اور منافقت کے طور پر ابھر کے سامنے آتی ہے تو اسی طرح کربلا جہدِ مسلسل اور عملِ پیہم کے ساتھ ساتھ حق اور سچ پر ڈٹ جانے کے نام سے ظاہر ہوتی ہے۔ الطافؔ کی زندگی گاؤں کا عمل دخل کیوں نہ ہو؟ ایک شخص جس نے آنکھیں گاؤں میں کھولی ہوں، گاؤں کی فضا میں پرورش پائی ہو، بچپن گاؤں

میں لٹایا ہوتو پھراس کی شاعری سے گاؤں کی تر و تازہ خوش بو کیوں نہ آئے؟ بہترین یادوں کا زمانہ بچپن تک ہی محیط ہوتا ہے۔ الطافؔ کے گاؤں کے دوست اس کی شاعری میں کہیں کہیں ذہن کے پردوں سے نکل کر قرطاس کی زینت بن جاتے ہیں۔ جس شخص نے ماں کا پیار گاؤں میں پایا ہو اور پھر ماں کو گاؤں ہی میں دفنایا ہو تو پھر کیوں نہ اس شخص کو گاؤں سے محبت ہو؟ ایک طرف تو گاؤں کے اس ماحول میں رہنے والے الطافؔ قریشی جب شہر کی جانب بڑھتے ہیں تو تو وہ سازشیں، نفسانفسی اور منافقت ہی منافقت دیکھتے ہیں تب وہ شہرِ جدید کو استعمال میں لاتے ہوئے شہر ضرار کو بیان کرتے ہیں۔ الطافؔ کی خواہش اور آرزو رہی ہوگی کہ گاؤں میں زندگی بسر کریں مگر تقدیر کے فیصلے شہر کی لڑکی سے عقد ہو گیا تو پھر شہر ہی کے ہو کر رہ گئے لیکن گاؤں کے جذبات پھر بھی ٹھنڈے نہ ہوئے وہ کہتے ہیں:

تو اثاثہ ہے اپنے گاؤں
خود کو شہروں میں مت لٹا جانا

(الطاف قریشی، شہر زندگی، ص۴۵)

الطافؔ نے اپنے احساس محرومی کو شعری انداز میں ڈال کر خوب صورت انداز میں گاؤں اور شہر کو الگ الگ کر دیا۔ اوپر بیان کی گئی علامتوں کا استعمال الطافؔ کے ان شعروں میں دیکھیں:

ان میں گر بولتے نہیں پنچھی
اس میں پیڑوں کی کیا خطا جاناں

(الطاف قریشی، شہر زندگی، ص۴۹)

ہرے بھرے پتوں کی شاخیں نگل گئی ہیں پیڑوں کی
رتوں نے ریزر پھیر دیے خوش بو کی شریانوں پر

(الطاف قریشی، شہر زندگی، ص۵۱)

اب نہ چھاؤں رہی ہے نہ پرندوں کا ہجوم
کٹ چکے بستی کے سب پیڑ پرانے الطافؔ

(الطاف قریشی، شہر زندگی، ص ۵۷)

دھوپ کی شدت نگل گئی ہے خوش بو کی ہریالی کو
رکا ہوا ہے ڈھلوانوں پر خوش بو کا پھیلاؤ

(الطاف قریشی،شہر زندگی،ص ۴۹)

فکری جائزہ:

اگر الطاف کی غزل کو مضامین کے حوالے سے دیکھا جائے تو الطاف کے ہاں خوف کا مضمون نمایاں ہے۔ یہ خوف ہے کیسا؟ اور کس چیز کا ہے؟ اس کا پورا ایک پس منظر ہے۔ دُور رس پس منظر کے پیچھے موت ہے جو کہ ایک اٹل حقیقت ہے جس سے کسی کو بھی انکار نہیں ہے اور جو ہر ذی فہم شخص کو متاثر کرتی ہے۔ بہ طور خاص شاعر کو کیوں کہ شاعر کسی بھی معاشرے کا حساس ترین فرد ہوتا ہے۔ وہ جب ماضی میں جھانکتا ہے اور مٹ جانے والی زندگی کو دیکھتا ہے تو اسے اپنا وجود بے معنی و حقیر نظر آتا ہے۔

اسی موت کی سہا سہی اور گہما گہمی ابدیت کی تلاش کا دوسرا نام فن ہے۔ ایک فن کار زندگی اور موت کے معاملات پر سنجیدگی سے غور و فکر کرتا ہے مگر وہ بھی اس خوف سے نکلنے کا خواہاں ہوتا ہے۔ الطافؔ کے ہاں یہ خوف موجود ہے لیکن یہ خوف موت تک محدود نہیں ہے اس کے ہوتے اگر چہ موت سے چھوٹتے ہیں لیکن اس کا سایہ بہت طویل ہے۔ زندگی کے قد کے برابر یہ ایک انجانا سا خوف، کسی بھی سطح پر کچھ ہو جانے کسی بھی موڑ پر کچھ کھو جانے کا خوف، ایک ایسی دستک جو کسی بھی وقت بغیر دستک دیے اندر آ سکتی ہے۔ ایک ان کہی جو اپنی مرضی کرتی ہے۔ خواہش کے باوجود بھی اُسے شائع نہیں کر سکتے۔ الطافؔ کے ہاں ہی خوف مختلف روپ میں سامنے آیا ہے۔

دروازہ اُٹھ کے کھولنے والا کہاں گیا
دستک لیٹ کے روتی ہے زنجیروں کے ساتھ

(الطاف قریشی،شہر زندگی،ص ۹۷)

دنوں کے اندر بھی سناٹا باہر بھی خاموشی ہے
موت کا بھاری قفل پڑا ہے نگر کے بارے مکانوں پر

(الطاف قریشی،شہر زندگی،ص ۱۰۷)

مر گیا وہ جو مر گیا بھائی
موت سے کس نے زندگی پائی

(الطاف قریشی،شہر زندگی،ص ۱۱۷)

الطافؔ قریشی پر جو غزل اترتی تھی اسے دیکھ کر محسوس ہوتا ہے اس غزل کے مضمون کی رو بہت تیز ہوئی تھی۔ الطافؔ اپنی غزلوں میں دیر تک اور دور تک اس رو کے ساتھ بہتے چلے جاتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ الطافؔ کے ہاں غزل کا بنیادی محرک یعنی احساس کہیں کہیں بہت مضبوط ہوتا ہے اور اس کی گرفت اتنی مستحکم ہوتی ہے کہ کبھی کبھی تو پوری غزل میں گونجتا نظر آیا ہے اور کئی شعروں میں مختلف رویوں کے ساتھ سامنے آیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کچھ احساس الطافؔ پر حاوی ہو جاتے ہیں تو پھر وہ غزلِ مسلسل کی طرف چل پڑتے ہیں۔ پھر غزل کے بنیادی خیال کی گونج بار بار سنائی دیتی ہے۔

گھر بلندی پر مت بنا جاناں
لے اڑے گی ایسے ہوا جاناں

(الطاف قریشی،شہر زندگی،ص ۱۱۹)

دونوں ہاتھوں سے ترا چہرہ چھپائے رکھنا
خوب تڑپانا مجھے ، خوب ستائے رکھنا

(الطاف قریشی،شہر زندگی،ص ۱۲۵)

الطافؔ نے غزل میں کہیں کہیں نئے تجربات بھی کیے ہیں۔ اگرچہ شعری روایات میں یہ تجربات پہلے سے ہو رہے تھے مگر کشمیر کے ادبی حلقوں میں ان تجربات کو کرنے والے الطافؔ قریشی الگ انداز اپناتے ہیں۔

آنچ دینے لگے پھر زخم پرانے الطافؔ
درد کو چھیڑ دیا تیز ہوا نے الطافؔ

(الطاف قریشی، شہر زندگی، ص ۱۰۷)

پیکر تراشی:

لفظیات کے ساتھ ساتھ الطافؔ کی غزل میں کچھ کچھ مصوری کا کام بھی ہے جِسے پیکر تراشی کیا جاتا ہے۔مصوری شاعری ہی ہے اور شاعری مصوری۔ایک شاعر اپنی تخیلی تصویر کو قلم کے زور سے الفاظ کا روپ دے کر کاغذ پر بناتا ہے۔ شوکت اقبالؔ مصور الطافؔ کی غزل میں پیکر تراشی کے حوالے سے بتاتے ہیں:

> ''الطافؔ قریشی مصور تھا کہ شاعر؟ یہ فیصلہ کرتے ہوئے میں تذبذب کا شکار رہا۔ان کے کچھ اشعار تو صاف بولتے ہیں کہ تصویر کو الفاظ میں ڈھالا گیا ہے اور الفاظ کی ترتیب اور خیال کے رنگوں سے شعر کو مکمل تصویر بنا کر رکھ چھوڑا ہے۔''۴

لفظوں سے تصویر بنانا ایسا ہی ہے جیسے ساحل پر کھڑے ہو کر آنکھ مرکوز کیے تصور کو ریت پر اتار دینا اور پھر وہی تصویر آنکھوں کے سامنے گھومتے رہنا جو کہ تصور تھا۔لیکن ایک شاعر کمال کرتا ہے اور الفاظ کو مجسمہ بنا کر شعری صورت میں سامنے لاتا ہے۔الطافؔ کی شاعری سیال مادے کی طرح ہے۔الطافؔ اپنے شعروں میں جو پیکر بناتے ہیں وہ جاذبِ نظر اُن کے خطوط بہت تیکھے، ان کی اُٹھان اور ان کے خدوخال بہت نازک اور نرم و ملائم ہیں۔نرم و نازک، حسین و جمیل اور مرمریں تصویر کشی کرنے والے شاعر الطافؔ کی پیکر تراشی کی کچھ خوب صورت مثالیں دیکھیں:

میں دیکھ تو سکتا ہوں تجھے چھو نہیں سکتا
تو جھیل میں اترے ہوئے نظر کی طرح ہے

(الطاف قریشی، شہر زندگی، ص ۱۷)

ہر شاعر اپنی سوچ کے بریدہ پروں کو جب الفاظ میں کھولتا ہے تو وہ ان پروں کو یک جا کر کے ایک ایسا پرندہ تخلیق کرتا ہے جو اس سے قبل فضا میں گیا ہی نہ ہو۔یہی الفاظ کے پرندے اس شاعر کو زندہ رکھتے ہیں اور امر کر دیتے ہیں۔الطافؔ کی غزل میں تخیلی و الفاظی پیکر کشی جا بہ جا بکھری پڑی ہے۔

کاڑھتا ہے دلوں پر وہ نہ خوش بو
اس کی سانسوں میں یک ہنرسا ہے

(الطاف قریشی، شہر زندگی، ص۳۱)

بحروں کا انتخاب:

جہاں الطافؔ نے غزل میں پیکر تراشی کی ہے وہ بھی اس سے بحروں کے انتخاب میں بھی احتیاط برتی ہے۔احمد ندیمؔ قاسمی کے مطابق:

''الطافؔ قریشی نے ایجاز کو اعجاز بنا دیا ہے کم سے کم الفاظ میں آفاق گیر وسعتوں کو سمیٹے چلے جانا الطافؔ قریشی کے کمال فن کی دلیل ہے۔''۵

چھوٹی بحر کے ساتھ ساتھ الطافؔ کی شاعری میں درمیانی بحر بھی موجود ہے مثلاً! طویل بحروں کی شاعری ہمیں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی ۔بحروں کے انتخاب نے الطافؔ کی شاعری کے مضامین کو بھی ایک آراستگی اور موزونیت بخشی ہے۔الطافؔ کی نمائندہ بحروں کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

گھر بلندی پر مت بنا جاناں
لے اُڑے گی اُسے ہوا جاناں

(الطاف قریشی، شہر زندگی، ص۴۷)

موسم کا چلن خوئے ستم گر کی طرح ہے
وہ اندھیرا کہ کچھ سجائی نہ دے

(الطاف قریشی، شہر زندگی، ص۵۲)

دین میں مصلحت نہیں جائز
دین کے یہ خادمین کہتے ہیں

(الطاف قریشی، شہر زندگی، ص۵۷)

یہ ہے دیوار اور یہ دَر سا ہے
گھر ہمارا بھی تیرے گھر سا ہے

(الطاف قریشی، شہر زندگی، ص۷۷)

الطافؔ کی غزل میں نئے شعری رویے ہیں۔غزل کو الطافؔ ایک نئی راہ اور نئی سَمت کی طرف لیے جا رہے ہیں۔ وہ غزل میں خیال کو پختہ کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ علامہ اقبالؔ کی طرح ایک نیا معنی اور پیغام دینے کے قائل ہیں۔ روایت سے ہٹ کر چلنے کے عادی اور روایت شکنی ہیں۔ وہ اپنے جگر کی آنچ سے اپنے شعروں کو سینچتے ہیں تب جا کر ایک جان دار اور با معنی آواز نظر آتی ہے جس کو وہ قارئین کی نذر کر دیتے ہیں۔ الطافؔ کی غزل کا قاری ان کے جذبات و احساسات کی کشش محسوس کرتا ہے۔ دکھ، درد، الم، موت کا خوف، گاؤں سے لگن، والدہ سے محبت، ریا کاری سے نفرت، اہلِ علم کی عزت، اہلِ فن کی حرمت، رویوں کے بدلاؤ اور موسموں کے ٹھہراؤ کو الطافؔ قریشی نے خوب صورتی کے ساتھ اپنی شاعری میں نبھایا ہے۔ ڈاکٹر آمنہؔ بہار، الطافؔ قریشی کی شاعری کے حوالے سے کہتی ہیں:

> ''الطافؔ قریشی دُنیائے غزل میں قدِ آدم کی طرح ہیں۔ کشمیر میں جب شعر و ادب پروان چڑھ چکا تھا تو اس شخص نے اس شعر و ادب میں مزید رنگ بکھیرنے کے لیے قلم اُٹھایا اور اسے امر کر دیا۔ ان کی شاعری میں سوز و گداز اور فکر و ساز کے ساتھ ساتھ ایک اُمنگ، ایک خواہش اور ایک اُمید ہے۔ الطافؔ قریشی بے شک کشمیری ادب میں ایک اُستاد کی حیثیت رکھتے ہیں''[۶]

الطافؔ کی غزل کا بہ غور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بہ لحاظِ مقدار غزل کم ہی مگر ملی ہے معیارِ غزل ستاروں سے آگے جاتا نظر آتا ہے۔ الطافؔ نے نادر تشبیہات اور استعارات کو استعمال کر کے اپنے فن کو عروج بخشا وہ معاشرتی ظلم و جبر کے خلاف مسلسل آواز اُٹھاتے نظر آتے ہیں۔ وہ انسانی اقدار میں جب گراوٹ محسوس کرتے ہیں تو وہ چلا چلا کر معاشرے کی توجہ اس جانب مبذول کرواتے ہیں۔ ایک شاعر کا یہ خاصا ہوتا ہے کہ وہ اپنی شاعری کے ذریعے سے قوم و ملک کے اندر برائیوں کی نشان دہی کرتا ہے۔ الطافؔ کے ہاں بھی یہ خوبی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے وہ شہر کا زوال بھی بیان کرتے ہیں تو شہرِ جدید کی تباہی کی پیش گوئی بھی کر رہے ہوتے ہیں۔ وہ غزل کے گیسو سنوارنے کے ساتھ ساتھ زلفِ شہر کو بھی تراشتے نظر آتے ہیں۔ وہ اپنی شاعری میں اپنے قبیلے کی پاس داری بھی کرتے ہیں اور کربلا والوں کے ساتھ ہونے والے ظلم پر ماتم کناں بھی ہیں۔ وہ بدلتی دُنیا، ترقی کی آڑ میں معاشرتی تنزلی اور بے راہ روی کو بھی شعری اُسلوب میں اپناتے نظر آتے ہیں۔

اُسلوبیاتی جائزہ:

الطافؔ قریشی کے ہاں فنی لوازم مکمل طور پر موجود ہیں۔ان کے فن میں وہ تمام عام عناصر بالخصوص موجود ہیں جن کو اُردو شاعری میں اور خصوصاً غزل میں اہم سمجھا جاتا ہے۔ یہ لوازماتِ شاعر اپنی دانست کے مطابق اور اکثر و بیشتر غیر دانستہ طور پر استعمال کرتا ہے۔ جب بھی کوئی شاعر ان محاسن کو استعمال میں لاتا ہے تو اس وقت وہ اس چیز کا خیال نہیں رکھتا کہ کس جگہ کون سا فن بروئے کار لائے۔ وقت کے ساتھ ساتھ قاری، سامع اور ناقدِ ادب اس بات کا تعین کرتے ہیں کہ کس طرح اس فن میں خوبیاں اور خامیاں تلاش کرے۔

الطافؔ قریشی کے ہاں فنی لوازمات کے حوالے سے جب ہم دیکھتے ہیں تو ان کے ہاں وہ تمام خصوصیات موجود ملتی ہیں جو کسی بھی کلام کی خوبی تصور کی جاتی ہیں۔ کلامِ الطافؔ قریشی میں ضائع و بدائع کے حوالے سے دیکھیں تو صنعتوں کے استعمال پر ان کی دسترس دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ وہ ان کے استعمال میں کس قدر ماہر تھے۔ انھوں نے نہایت احتیاط کے ساتھ اپنے کلام میں فنی لوازم کو برتا ہے جیسا کہ آمنہؔ بہار بتاتی ہیں:

''الطافؔ قریشی فنی اُصول وضوابط پر مکمل دسترس رکھتے تھے۔ ان کے کلام میں صنعتوں کا استعمال اِس بات کی غمازی کرتا ہے کہ وہ فنِ شعر گوئی میں کسِ حد تک شاق تھے۔''[۷]

صنعتِ تضاد:

صنعتِ تضاد اُردو شاعری کی مقبول عام صنعت ہے۔ اس قدر مقبول صنعت کو بھلا الطافؔ قریشی جیسے کہنہ مشق شاعر کیسے استعمال نہ کرتے؟ الطافؔ قریشی کے کلام میں اس صنعت کی مثالیں جگہ جگہ نظر آتی ہیں۔ الطافؔ قریشی کی ایک معروف غزل کا شعر دیکھیں:

ان گھنے پیڑوں کی چھاؤں نے جلایا ہے مجھے
لگ کے بیٹھا ہوں کڑی دھوپ کی دیوار کے ساتھ

(الطاف قریشی، شہر زندگی، ص۸۸)

صنعت تضاد کا حامل ایک اور شعر ملاحظہ ہو جو الطافؔ قریشی کے فن کا غماز ہے۔

یہی جو سلسلہ ہے روز وشب کا
بلا کا دوست ہے ، دشمن غضب کا

(الطاف قریشی،شہر زندگی،ص۹۸)

مراعات النظیر :

تضاد کے ساتھ ساتھ ایک اور مقبول صنعت مراعات النظیر کہلاتی ہے۔مراعات الطیف میں بھی الطافؔ قریشی عدیم المثال نظر آتے ہیں۔انھوں نے اپنے کلام میں صنعت مراعات النظیر کو بھی نہایت خوش اُسلوبی سے برت کر دکھایا ہے۔الطافُ قریشی کے کلام میں سے مراعات النظیر کے حامل یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

کشتیاں اپنی کناروں پر سلامت رکھنا
اک سمندر ہے کھلا ساحلِ جاں سے آگے

(الطاف قریشی،شہر زندگی،ص۳۷)

سمندر کی رعایت سے کشتی، کنارہ اور ساحلِ کو جس خوب صورتی سے استعمال کیا ہے وہ قاری کے لیے باعثِ لطف ہے۔

موسم کا چلن خوئے ستم گر کی طرح ہے
جھونکا بھی ہوا ہے تو صر صر کی طرح ہے

(الطاف قریشی،شہر زندگی،ص۴۴)

کچھ ہوا میں نمی ہے الطافؔ
ابر شاید کہیں پر برسا ہے

(الطاف قریشی،شہر زندگی،ص۷۷)

الطافؔ قریشی کے کلام میں جدید غزل کی جملہ خصوصیات کے حوالے سے اگر مراعات النظیر کی بات کریں تو ان کے ہاں اس صنعت کی بھی قطعاً کوئی کمی نظر نہیں آتی۔رنگین غزل میں یہ صفت اپنی اہمیت میں بے مثال ہے۔ایک ہی لفظ کی رعایت سے دیگر لفظوں کو برتنا خاصے کی چیز ہے۔الطافؔ قریشی چوں کہ صاحبِ مطالعہ اور صاحبِ علم شاعر تھے اس وجہ سے

ان کے لیے یہ فن دقت کا باعث نہیں تھا۔ان کے مراعات النظیر کی مثالیں اس قدر جان دار اور عمدہ ہیں کہ قاری حیرت زدہ ہو جاتا ہے۔مثال کے طور پر شعر ملاحظہ کریں:

مختلف روپ ہیں مشقت کے
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

(الطاف قریشی،شہر زندگی،ص۸۹)

روپ کی رعایت سے غمزہ اور پھر عشوہ کے ساتھ ادا کا استعمال مراعات النظیر کی خوب صورت مثال ہے۔الطافؔ قریشی کی غزل میں تخیل کی باریکیاں ڈھونڈنے کے لیے ان کے مراعات النظیر کے حامل درج ذیل اشعار دیکھیں۔جن میں میرؔ کا سا انداز ان کی روایت کی پاس داری بھی واضح کرتا ہے۔

شاخ شاخ سونی ہے پیڑ پیڑ تنہا ہے
حرف کے چمن بتلا ، تجھ پر کس کا سایہ ہے

(الطاف قریشی،شہر زندگی،ص۶۷)

یہ ہے دیوار اور یہ در سا ہے
گھر ہمارا بھی تیرے گھر سا ہے

(الطاف قریشی،شہر زندگی،ص۸۷)

موسم کا چلن خوئے ستم گر کی طرح ہے
جھونکا بھی ہوا ہے تو صرصر کی طرح ہے

(الطاف قریشی،شہر زندگی،ص۸۱)

جبر ہستی نے جوانی میں عطا کی پیری
خود کو الطافؔ میں اب عمر رسیدہ لکھوں

(الطاف قریشی،شہر زندگی،ص۸۸)

تراکیب سازی

الطافؔ قریشی کے ہاں جذبات میں سچائی بھی ہے اور گہرائی بھی موجود ہے۔تخیل میں انھوں نے گہرائی کے ساتھ جدید تراکیب بھی پیدا کی ہیں اور نئے الفاظ کا بھی خوب صورت استعمال کیا ہے۔ دیگر شعرا کی طرح قدیم اندازِ بیان موجود ہے،ہی اس پر نیا لہجہ الطافؔ قریشی کی خصوصیات ہے۔ جدید غزل کی بنا تو قدیم غزل ہی ٹھہری قدیم شعرا کے ہاں جو طرزِ تخیل ہے اس سے الطافؔ قریشی متاثر نظر آتے ہیں لیکن بوجہ اس میں بھی ان کی انفرادی شان برقرار رہتی ہے۔الطافؔ قریشی کی غزل سے یہ مثال دیکھئے۔

مجھے اسیری دیوار و در قبول نہیں
تمام عمر مجھے یونہی دربدر رکھنا

(الطاف قریشی،شہر زندگی،ص ۶۷)

شیشہ گاہِ جمال گزرسا ہے
وہ جو بستی میں اک کھنڈر سا ہے

(الطاف قریشی،شہر زندگی،ص ۲۸)

یہ سب قصے ہیں بس کذبِ نظر کے
کوئی چہرہ طلسماتی نہیں ہے

(الطاف قریشی،شہر زندگی،ص ۳۷)

الطافؔ قریشی کی غزل دل کشی اور سوز و گداز کے ساتھ مضامین کی بھی کمی نہیں۔ جس عہد میں الطافؔ قریشی نے غزل کے میدان میں قدم رکھا اس وقت آزاد کشمیر میں شاعری کی طرف زیادہ رجحان نہ تھا۔تاہم بعض شعرا نے اپنی ذاتی لگن سے شعر وسخن کی دُنیا میں قدم رکھے۔ان لوگوں میں الطافؔ قریشی ایسے شاعر ہیں جو اس میدان میں کام یاب رہے اور نام پیدا کیا۔الطافؔ قریشی کی غزل کو دیکھ کر یہ کہنا قطعاً مشکل نہیں کہ انھوں نے جو غزل کہی وہ دِل سے کہی۔غزل ان پر یوں مہربان رہی کہ ہر طرح سے ان کے ساتھ وفا کی۔ وہ سخن کی منزل کی طرف یوں بڑھے کہ واپسی کی تمام راہیں مقفل کر دیں۔ بہ قول الطافؔ قریشی:

اب گھروں کو واپسی ممکن نہیں

ہم جلا بیٹھے ہیں اپنی کشتیاں

(الطاف قریشی، شہر زندگی، ص۶۵)

یعنی وہ اس نگری میں ہمیشہ کے لیے مقیم ہو گئے الطافؔ قریشی کے کلام میں سے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے تراکیب کے ساتھ ساتھ مضامین کو بھی نفاست سے باندھا۔

الطافؔ ثنا خوانی خوش بو سے مُکر جا
رنگوں کے خریدار خفا ہونے لگے ہیں

(الطاف قریشی، شہر زندگی، ص۶۷)

جدت کا حامل بذیل شعر دیکھیں۔

روح کی گہرائیوں میں جذب ہے
حسنِ سادہ کی ادائے دِلستان

(الطاف قریشی، شہر زندگی، ص۹۳)

الطافؔ قریشی کا دفتر بھی کیا خوب ہے ان کا دفتر کا یہاں ان کے کلام میں ایک نئی طرح ڈالتا ہے۔ دفتر اُردو شاعری میں ایک ایسا موضوع ہے جس کو مختلف معنوں میں استعمال کیا گیا۔ الطافؔ قریشی کا دفتر جدید دفتر ہے جس میں وہ ایک خاص وقت گزارتے ہیں اور معاش کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ ان کے ہاں سرکاری ملازمین یا نجی ملازمین جن کی مکمل تصویر کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ وہ ان لوگوں کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں جو دفاتر سے وابستہ ہیں جس طرح کچھ شعرا نے مثلاً تنویر سپرؔا نے کارخانوں کی اور مزدورں کی زندگی کی بات کی۔ ایسے ہی الطافؔ قریشی نے دفاتر میں کام کرنے والے ملازمین کی بات کی ہے الطافؔ کے مطابق دفاتر میں کام کرنے والے فائلوں کے بوجھ تلے دبے رہتے ہیں۔ وہ لوگ جو دفاتر سے وابستہ ہوتے ہیں ان کی زندگی میں فائلیں ہی فائلیں ہوتی ہیں وہ چہرے پڑھنے سے ناآشنا اور نابلَد ہوتے ہیں جس وجہ سے دھوکا کھا جاتے ہیں۔ اب یہ دھوکا یقیناً محبت کا دھوکا ہے جس کو الطافؔ قریشی نے ایسے عمدہ تخیل سے یوں بیان کیا ہے۔

دفتروں میں جکڑی رہتی ہے ہم لوگوں کی جان

فائلیں پڑھنے والوں کو کیا چہروں کی پہچان

(الطاف قریشی،شہر زندگی،ص۵۹)

اِس طرح الطاؔف قریشی نے اپنے غزل میں غیر شعری الفاظ کو بھی بہت نفاست سے شعری آہنگ عطا کر دیا ہے۔ دفتر ہی کے موضوع کو کچھ یوں نبھاتے ہیں۔

ہم مشین ہیں کام کرنے کی
اور یہاں کام کا صلہ کیا ہے

(الطاف قریشی،شہر زندگی،ص۹۸)

کل میں دفتر نہ آسکوں شاید
مجھ کو درپیش اک سفر ہے

(الطاف قریشی،شہر زندگی،ص۱۰۲)

ایک سی صبحیں ایک سی شامیں
حیرتی ہوں یہ سلسلہ کیا ہے

(الطاف قریشی،شہر زندگی،ص۲۳)

الطاؔف قریشی اس مشین دور میں اس قدر نالاں ہیں کہ ان کے مطابق اس دور میں انسان سے بھی انسانیت سے بعید سلوک روا رکھا جاتا ہے۔الطاؔف قریشی اس نظام سے نالاں اور خائف دکھائی دیتے ہیں وہ بے جا کام کی تھکن اپنی محنت کا صلہ مانتے ہیں جتنا بھی کام وہ کرتے ہیں بدلے میں سوائے تھکن کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔آج ہمارے معاشرے میں غریب کا معیار زندگی بھی یہی ہے کہ اس سے بے تحاشا کام لے کر بدلے میں بہت ہی قلیل اجرت سے نوازا جاتا ہے۔شعر دیکھیں۔

جسم میں اتری ہوئی سرد تھکن کو الطاؔف
اپنی بے انت مشقت کا صلہ مان لیا

(الطاف قریشی،شہر زندگی،ص۴۵)

الطافؔ قریشی اس تناظر میں اپنے خواب چھن جانے کا ملال یوں بیان کرتے ہیں۔

ہمارے خواب چوری ہو گئے ہیں
اثاثہ لٹ چکا الطافؔ کب کا

(الطاف قریشی، شہر زندگی، ص ۵۷)

درج بالا اشعار سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ الطافؔ قریشی کے ہاں دفتر ایک علامت ہے مشقت کی، تھکن کی ان کے ہاں دفتر خوابوں کا ایک مدفن ہے۔ جس میں کام کرنے والے اپنے خواب دفن کر دیتا ہے۔

دفتر کے علاوہ الطافؔ قریشی نے گاؤں کی علامت بھی بہت خوب استعمال کی ہے۔ ان کے نزدیک گاؤں میں محبت ہے تو شہر میں عداوت، گاؤں میں چھاؤں ہے تو شہر دھوپ، گاؤں میں رشتوں کی سچائی ہے تو شہر میں انھی رشتوں کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے، گاؤں میں بہار ہے تو شہر خزاں کی صورت الطافؔ قریشی کا گاؤں ایک گوشۂ طرب اور گوشۂ عافیت ہے جب کہ شہر میں فقط دکھ اور کرب ہی ہیں۔ بے حسی کا دوجا نام شہر ہے اور اپنائیت کا دوسرا نام گاؤں۔ ڈاکٹر آمنہ بہارؔ کے مطابق:۔

''الطافؔ قریشی کے ہاں گاؤں کی علامت رشتوں کی وفادار اور رشتوں کی سچائی کے علاوہ دردمندی، محبت اور خوشیوں کا ایک نگر ہے۔ اُن کی شاعری میں اس علامت کا ایک الگ ہی ذائقہ اور مٹھاس ہے۔''۸

الطافؔ قریشی کے کلام میں ایسے اشعار کی ہرگز کمی نہیں ہے جن میں وہ دیہی زندگی کو بہت ہی پرسکون اور اپنائیت کی حامل بتاتے ہیں۔ الطافؔ قریشی کے ہاں اس علامت کے حامل اشعار ملاحظہ ہوں:

دھوپ کی شدت نگل گئی خوش بو کی ہریالی
رُکا ہوا ہے ڈھلوانوں پر خوش بو کا پھیلاؤ

(الطاف قریشی، شہر زندگی، ص ۵۷)

اس شہر میں دستک پر کوئی در نہ کھلے گا
یہ شہر تو اب قبر کے اندر کی طرح ہے

(الطاف قریشی، شہر زندگی، ص ۵۷)

شہر اور گاؤں میں باقی مسافت کتنی
اپنی میراث کا انجام نہ پوچھا ہوتا

(الطاف قریشی، شہر زندگی، ص ۵۷)

گاؤں سے آکے شہر میں ہم دربہ در ہوئے
جن معرکوں پہ نکلے تھے کیا خوب سر ہوئے

(الطاف قریشی، شہر زندگی، ص ۵۷)

شہر پھیل کر پہنچے گاؤں کی زمینوں ایک
اس سے آگے سوچوں تو دِل دھڑکنے لگتا ہے

(الطاف قریشی، شہر زندگی، ص ۵۷)

اب ضرورت نہیں شہروں کو مری
میرے گاؤں کو خبر کردیجئے گا

(الطاف قریشی، شہر زندگی، ص ۵۷)

ان اشعار کی روشنی میں ہم بہ آسانی کہہ سکتے ہیں کہ الطاف قریشی پھیلتے شہروں سے خوف زدہ تھے۔ان کو اس بات کا شدید خوف ہے کہ اک روز یہ شہر پھیل کر گاؤں کو ختم کر ڈالیں گے۔ان کا یہ خدشہ اس لیے بھی ہے کہ شہر میں نفسانفسی کا عالم ہے اگر گاؤں میں بھی یہ ہی ماحول ہوگیا تو چاہتیں اور محبتیں بھی عداوت اور نفرت میں بدل جائیں گے۔شہر اور گاؤں میں جو فرق ہے وہ فرق اس وقت یقیناً دم توڑ دے گا جب شہروں کے زیر اثر گاؤں بھی آجائیں گے۔الطاف قریشی کا یہ خدشہ ان کو بے چین رکھتا تھا اور وہ اس ایک بات سے بے چین رہتے ہیں۔وہ بہت واضح الفاظ میں بتاتے ہیں کہ جب وقت ہاتھ سے نکلتا ہے تو شہر والے مطلب نکال کر بالکل بھلا دیتے ہیں لیکن دیہات میں عزت وآبرو قائم رہتی ہے۔

زاہدؔ کلیم
مختصر حالات زندگی

آزاد کشمیر کی ادبی فضا کو پروان چڑھانے میں جن لوگوں نے اپنا حصہ ڈالا ان میں ایک بڑا نام محمد خان نشترؔ کا بھی ہے۔ محمد خان نشترؔ آزاد کشمیر کے معروف اور مقبول شاعر اور ادیب ہیں۔ آزاد کشمیر میں انجمن ترقیٔ اُردو کے قیام کے ساتھ ساتھ دیگر ادبی سرگرمیاں بھی آپ کی مرہونِ منت ہیں۔ اس دور میں جب یہاں شعر و ادب کا چرچا ہوا تو محمد خان نشترؔ کے گھر چاند سا بیٹا پیدا ہوا۔ ۱۹۵۴ء کی ۲۶ جنوری کو پیدا ہونے والے اس بچے کا نام ''محمد الیاس خان'' رکھا گیا۔ یہی محمد الیاس خان ہے جس نے اپنے جاندار کلام کے ذریعے اُردو دُنیا میں زاہدؔ کلیم کی قلمی نام سے شہرت سمیٹی۔ زاہدؔ کلیم کے مطابق:

> ''میرا حقیقی نام محمد الیاس خان ہے۔ طبیعت کا میلان شعر و ادب کی جانب ہوا تو نام بدل کر زاہدؔ کلیم رکھ لیا۔ آج زاہدؔ کلیم سے تو دُنیا واقف ہے لیکن محمد الیاس خان کو کوئی نہیں جانتا'' ۹

زاہدؔ کلیم کی ابتدائی تعلیم عام دستور کے مطابق گھر پر ہی ہوئی۔ مسجد سے قرآن کا سبق پڑھا جو کہ ہمارے ہاں عام طور پر رائج تھا۔ اسکول کی ابتدائی تعلیم گورنمنٹ اسکول مدینہ مارکیٹ مظفرآباد سے حاصل کی۔ بعدازاں اسی ادارے سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ طبیعت میں لااُبالی پن کی وجہ سے اور باپ کی بے پناہ شفقت کے باعث روایتی تعلیم ترک کر دی۔ انٹرمیڈیٹ کا امتحان بہ طور پرائیویٹ اُمیدوار پاس کیا۔

زاہدؔ کلیم کو گھر میں جو ادبی ماحول میسر آیا اس کے زیرِ اثر ہی آپ نے چھوٹی عمر میں ہی بڑے بڑے شعرا کو پڑھ ڈالا۔ بالخصوص غالبؔ، اقبالؔ اور جوشؔ خصوصی مطالعے کا حصہ رہے۔ بچپن میں ہی شکوہ اور جواب شکوہ حافظے کا حصہ بن گئیں۔ جوشؔ ملیح آبادی اس وقت چوں کہ حیات تھے۔ اس لیے زاہدؔ کلیم کی خوش قسمتی کہ انھوں نے گھر میں اُستاد ہونے کے باوجود جوشؔ صاحب کو ہی اُستاد چنا۔ زاہدؔ کلیم کے مطابق:

> ''جوشؔ صاحب نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا اور انھی سے مجھے اصلاح لینے کا شرَف بھی حاصل ہے''۔ ۱۰

زاہدؔ کلیم کو کلامِ موزوں کا ملکہ قدرتی طور پر حاصل تھا۔ ان کے اندر یہ صلاحیت موجود تھی کہ وہ کلام موزوں کر لیتے

تھے۔اس پرطرہ جوشؔ ملیح آبادی جیسے اُستاد کی قربت نے ان کی صلاحیتوں کو جوجلا بخشی وہ بلا شبہ قابل ستائش ہے۔جوشؔ ملیح آبادی کی مصاحبت نے ان کے دل و دماغ کے بند دروا کیے اور تاریک گوشوں کو منور کرتے ہوئے ان کی زندگی کو ایک نئی جرأت عطا کی۔ادبی محافل اور مشاعروں میں خاطرخواہ دل چسپی رکھتے تھے۔زاہدؔ کلیم نے جوشؔ کے رنگ کو اپنایا ضرور مگر اس رنگ میں اپنے آپ کو پنہاں نہیں ہونے دیا۔

زاہدؔ کلیم کی کئی تصانیف منظرعام پرآ چکی ہیں۔۱۹۷۵ء میں اشاعت پذیر ہوا۔دوسرا مجموعہ ''محرابِ فکر'' ۲۰۰۶ء میں سامنے آتا ہے جس کے ٹھیک دوسال بعد ۲۰۰۸ء میں رُوحِ انقلاب نام سے نعتیہ تصنیف شائع ہوئی۔علاوہ ازیں اچھا خاصا کلام غیر مطبوعہ صورت میں موجود ہے جس کو معاشی تنگی کا سامنا ہے۔کئی طرح کی نثری تحریریں بھی زاہدؔ کلیم کی قلم پر دسترس کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

فنی خصوصیات:

زاہدؔ کلیم کے بارے جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا بہت ابتدا سے ہی شعری علائم و رموز سے آشنا تھے۔ان کے کلام کو دیکھ کر اس بات کا اندازہ کرنا بہت ہی سہل ہے کہ ان کے ہاں شاعری کس طرح اترتی ہے۔شاعری میں ایک استادِ سخن کی محبت نے ان کے اندر فنی چابک دستی کے جوہر نمایاں کیے وہ ان کے کلام میں جابہ جا دیکھے جا سکتے ہیں۔جوشؔ چوں کہ اُردو زبان سے محبت کرنے والوں میں بڑا نام ہے یہی چیز ان کے شاگرد کے ہاں بھی جھلکتی ہے۔زاہدؔ کلیم کی زبان دانی میں ان کے استاد کا پرتو دیکھا جا سکتا ہے۔علم بدیع اور علم بیان کی تمام تر دل کشیاں زاہدؔ کلیم کے کلام میں یک جا نظر آتی ہیں۔زاہدؔ کلیم کی غزل فنی لوازمات پر پورا اترتی ہے۔ جہاں حسنِ الفاظ اور لفظی دل کئی قاری کو سحر میں مبتلا کرتی ہے وہیں استعارات، تشبیہات اور صنائع و بدائع سے ان کے کلام کا چمن بہار کھلاتا ہے۔ان کی نظم میں بھی غزل کا آہنگ جھلکتا ہے۔''نغمہ تارِ حیات'' سے ایک شعر دیکھیں جس میں لفظی کارگری کی خوب صورت جھلک ملتی ہے۔

مری نگاہوں کے سائے میں چین پاتا تھا
مری جدائی میں بے برگ و بار تھا جو شخص

(زاہدکلیم،نغمہ تارحیات،ص ۲۷)

نگاہوں کا سایہ تو اُردو میں عام ہے لیکن کسی زندہ شخص کو بے برگ و بار بنا دینا اور اس قدر نفاست سے کہ قاری خوش

کن تاثر لے خاصے کی چیز ہے۔اسی طرح اُردو شاعری کی مقبول ترین صنعت تلمیع کا خوب صورت استعمال ملاحظہ ہو۔

ہر ایک بات ہماری ہے رہبر کا چراغ
ہر ایک شعر ہمارا، ترانۂ منصور

(زاہدؔ کلیم،نغمہ تارحیات،ص۳۲)

حسین بن منصور کے لیے ہمارے ہاں عموماً منصور ہی بولا جاتا ہے حالاں کہ منصور ان کے والد تھے۔ باوجود اس کے تاریخ کا ایک زندہ کردار جس نے اپنے نعرے ''ان الحق'' کی بدولت خود کے لیے پھانسی کا پھندا تیار کروالیا۔

صنعتوں کے استعمال سے جہاں کلام میں ندرت اور رنگینی پیدا ہوتی ہے وہیں اس سے شاعر کی قابلیت بھی عیاں ہوتی ہے بہ قول ڈاکٹر یوسف حسین:

''صنائع لفظی و معنوی سے شاعری کو اپنے تخیل کی پرواز میں مدد ملتی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ ان کا استعمال برمحل اور تکلف اور تصنع سے اختراز کیا جائے۔ اگر صنعت کی خاطر صنعت برتی جائے اور شعر کہا جائے تو رمزی تاثیر مجروح ہو جائے گی''۔۱۱

زاہدؔ کلیم کے ہاں جب دیگر صنعتوں کو ڈھونڈا جائے تو اس میں بھی کسی قسم کی دقت کا سامنا نہیں ہوتا۔ بلاشبہ ان کے کلام میں صنعتی بازی گری اور لفظی ترنگ موجود ہے۔صنعت تلمیع کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو:

جِس نے قصور کفر و ضلالت گرادیے
جس نے فریض عیسیٰ مروع بنا دیے

(زاہدؔ کلیم،نغمہ تارحیات،ص۲۹)

اسلامی تاریخ سے گہری وابستگی زاہدؔ کلیم کے اس شعر میں بھی اور اس جیسے کئی دیگر شعروں میں عیاں ہوتی ہے۔شعر دیکھیے۔

ہر اشِک غم ہے نوح کا طوفان لیے ہوئے
ہر آرزو ہے خونِ رگِ جان لیے ہوئے

(زاہدؔ کلیم،نغمہ تارحیات،ص۲۷)

تلمیحات کے علاوہ تراکیب کا استعمال بھی زاہد کلیم نے خوب کیا ہے۔

اب نہ عذرا ہے نہ شیریں ہے کوئی اے زاہد
عشق نے کس کے تجھے وامق و فرہاد کیا

(زاہد کلیم،محراب فکر،ص ۲۸)

کربلا اُردو شاعری میں کامیاب استعارہ بن چکا ہے یہ ظلم و بربریت کی ایسی داستان ہے جسے معاشرے کے حساس فرد نے تسلسل کے ساتھ استعمال کیا۔ ہر مذہب اور ہر دور میں نواسئہ رسول ﷺ کی اس لازوال قربانی کا نوحہ جاری رہا۔ زاہد کلیم کے ہاں اس تلمیح کو جس طرح استعمال کیا ملاحظہ ہو۔

رسمِ شبیر ؓ اپنائے گا وہی اب جس کے
دِل میں ایمان کی لو ہاتھ میں قرآن ہو

(زاہد کلیم،محراب فکر،ص ۳۷)

صنعت مراعات النظیر بھی کلام میں خوب صورتی پیدا کرتی ہے۔ زاہد کلیم چوں کہ اقبال و جوش سے متاثر نظر آتے ہیں اور اقبال کے ہاں بھی اور جوش کی شاعری میں بھی مراعات النظیر موجود ہے۔ زاہد کلیم کے ہاں اس صنعت کا استعمال بہ آسانی مل سکتا ہے۔ یہ صنعت ہر دور میں مقبول رہی ہے۔ زاہد کلیم کی غزل میں مراعات النظیر کی جھلک ملاحظہ ہو۔

جانچی نہ ذات دیکھا نہ پیمانہ صفات
یہ ہے اجل کی راہ کہ ہے جادہ حیات

(زاہد کلیم،نغمہ تارحیات،ص ۷۷)

اس شعر میں جہاں مراعات النظیر کی عمدہ مثال ملتی ہے اس کے ساتھ ہی ہمارے معاشرے کی ایک بدعت بھی نظر آتی ہے جس کے مطابق ہم لوگ عبادات تو نہیں کرتے اور مزارات پر جا کر اپنی بخشش کے لیے اس یقین کے ساتھ دُعا مانگتے ہیں کہ ضرور ہم بخش دیے جائیں گے۔ ہمارے معاشرے کا یہ ایک بہت بڑا المیہ ہے جس کی طرف شاعر نے اشارہ کیا ہے۔

صنعت ترافق بھی شاعری میں برتنا ایک فن ہے۔ اس صنعت کے مطابق مصرعوں کی ترتیب الٹ کر کے پڑھنے

سے بھی مفہوم پنہاں نہیں ہوتا۔ مصرعہ اولی کی جگہ اگر مصرع ثانی کو بھی پڑھ دیا جائے تب بھی معنی برقرار رہتا ہے۔ یہ فن اساتذہ سخن کے ہاں ملتا ہے جس کو زاہدؔ کلیم نے بھی غیر شعوری طور پر اپنایا ہے۔ مثال دیکھیں:

مہر و وفا نہیں ہے تمھارے قلوب میں
تم نے لگائی آگ ، شمال و جنوب میں

(زاہدکلیم، نغمہ تارحیات، ص۱۰۳)

اب اگر اس شعر کی ترکیب بدل دی جائے تو بھی کوئی مضائقہ نہیں۔

تم نے لگائی آگ ، شمال و جنوب میں
مہر و وفا نہیں ہے تمھارے قلوب میں

(زاہدکلیم، نغمہ تارحیات، ص۱۰۷)

تضاد اُردو شاعری کی شاید سب سے مقبول صنعت ہے۔ لفظوں کے استعمال کا نیز اس صنعت میں لازمی ہے۔ ایک مصرع یا شعر جس میں ایک لفظ کی ضد سے دوسرا الفاظ استعمال ہو۔ یہ نسبتاً آسان ترین صنعت بھی ہے۔ زاہدؔ کلیم کے ہاں صنعتِ تضاد کی بیسوں مثالیں مل سکتی ہیں۔

جس کے کرم نے بن کو بھی گلشن بنا دیا
پتھر کو جس کے فیض نے درپن بنا دیا

(زاہدکلیم، محراب فکر، ص۶۲)

زاہدؔ کلیم کے فنی محاسن میں تراکیب سازی بھی نمایاں ہے۔ ان کے ہاں فارسی و عربی تراکیب کی بہتات ملتی ہے جس کا بین ثبوت ان کی کتب کے نام ہیں۔ زاہدؔ کلیم کی تراکیب سازی میں سے چند تراکیب دیکھیے۔

کشف و کشور، شورِ نشاط، کشتۂ نیونگ، سوارِ سمندر، ہست و بود، عکس جمال و وفا، پرچم گیسو کے جاناں، جنبشِ مژگانِ الفت، متاعِ ذیست، دیدہ گریاں، مشقِ ستم، چراغِ صوفشان، مہر نیم روز، چراغِ آرزو، اندامِ قصرِ شش جہالت، گوہر نایاب، عشق جاوداں، بزم و بود جیسی تراکیب کے علاوہ دیگر بے شمار تراکیب زاہدؔ کلیم کے کلام کا خاصا ہے۔ وہ ایک ماہر جوہری کی طرح لفظوں کو مصرعوں کی مالا میں پروتے ہیں۔

زاہدؔ کلیم کی شعری فکر

زاہدؔ کلیم کی غزل میں فکری سطح پر وہ تمام رنگ اور موضوعات شامل ہیں جن سے انسانی زندگی عبارت ہے۔ اس کی غزل میں جن کی رنگینی اور واردات عشق کا بیان ہے اور اس کے لوازمات کا اظہار بھی۔ فلسفیانہ فکر بھی ہے اور صوفیانہ الہیاتی خیالات بھی، غم روزگار بھی ہے غم دوراں کی جھلک بھی، انسانیت کے دکھ بھی ہیں اور حدیث زندگی کا بیان بھی، سماجی و معاشرتی اونچ، نیچ کی تلخی بھی ہے اور سیاسی و معاشی عدم مساوات ہر احتجاج بھی، زاہدؔ کلیم کی شاعری میں عصری و سیاسی شعور کا بھرپور اظہار ہوتا ہے۔ زاہدؔ کلیم نے زندگی کو ایک شاعر کی آنکھ سے دیکھا اور اپنی جمہوری بصیرت نے اُن کے مشاہدات کو شعر کے قالب میں ڈھال دیا۔ زاہدؔ کلیم کی غزل گوئی کی فکری جہات اور موضوعات کا اجمالی جائزہ ذیل میں پیش ہے۔

حسن و عشق:

حسن و عشق کا بیان اُردو شاعری کی قدیمی روایت ہے اور اس کے بغیر شاعری کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ پہلے فرد سے لے کر زمانہ موجود تک جس شخص نے بھی اپنے جذبات کو شعری صورت میں بیان کیا، اس نے حسن اور عشق کو ہی سامنے رکھ کر شاعری کی۔ شاعری میں حسنِ فطرت کا اظہار لازمی ہے۔ شاعر فطرت کی طرف متوجہ ہوئے بغیر رہ ہی نہیں سکتا اور فطرت کا حسن اس کا اولین مخاطَب ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی حسن پرستی اور حسن کی پذیرائی شاعر کی فطرت کا لازمہ ہے۔ ولؔی دکنی جسے اُردو غزل کا باوا آدم کہا جاتا ہے کی پہچان جمال پرستی اور اس کا برملا اظہار ہے۔ ولؔی دکنی کے علاوہ میرؔ تقی میرؔ، مرزا غالبؔ، حیدر علی آتشؔ، اقبالؔ و فیضؔ اور قدیم و جدید تمام شعرا نے اپنے شعر کو حسن و عشق سے مزین کی اور اسی فکر کے بیان سے شاعرانہ مقبولیت حاصل کی۔ حسن و عشق کے موضوعات کے بارے میں مولانا الطاف حسین حالؔی اپنی کتاب مقدمہ شعر و شاعری میں لکھتے ہیں:

> ''جن لوگوں نے اول غزل لکھی ضروری ہے کہ انھوں نے عشق و محبت کے اسباب اور ملاعی
> محض قدرتی اور سیدھے طور پر معشوق کی صورت، حسن و جمال، نگاہ اور ناز و انداز وغیرہ کو
> قرار دیا ہوگا''۔۱۲

عشق و محبت کے بیان کے بغیر اُردو شاعری کی تصویر مکمل نہیں ہو سکتی، زاہدؔ کلیم کی غزل میں حسن و عشق کا بیان شعری روایت کے بھرپور چاؤ اور تاثیر سمیت موجود ہے۔ زاہدؔ کلیم کی غزل کے اشعار حسن و عشق کی لطافت سے بھرپور ہیں اور حسن و

عشق کا بیان تہذیبی سبھاؤ وقار اور خوشگواریت کے احساس سے مزین ہے۔ان کی غزل میں گل کے حسن و دل فریبی کے ساتھ ساتھ بُلبل کی نغمہ سرائی اور کیفیت پرستی کا اظہار ہے۔ان کے حُسن کے رنگ اپنی پوری رعنائی سے جھلکتے ہیں وہیں عشق کا اظہار تہذیبی حدود کی پابندی کرتا اور اپنے تمدنی اساس کو ملحوظ خاطر رکھتا نظر آتا ہے۔ان کے ہاں جذبات واحساسات کی پاکیزگی اور اظہار کی لطافت وتاثیر قاری کو مسحور کر دیتی ہے۔اُن کے حسن وعشق کے مضامین ان اشعار سے ظاہر ہوتے ہیں۔

اہلِ چمن نثار ہیں ہونٹوں کے رنگ پر
مستی فدا ہے جسمِ کی موج ترنگ پر

(زاہد کلیم،محراب فکر،ص ۹۷)

اتنے نادان ہیں واللہ کہ ہم کو جس نے
ہن کے دیکھا اسے بس جانِ و فا مان لیا

(زاہد کلیم،محراب فکر،ص۱۰۲)

سنبھالا اپنے دل کو لاکھ میں نے وقت نظارا
مگر وہ نیند کی ماتی، دلہن دیکھی نہیں جاتی

(زاہد کلیم،نغمہ تارحیات،ص ۲۷)

زاہد کلیم کی شعری بندش اور لفظی کاری سے اُن کے محبوب کا جلوں اور کردار واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔اُن کا شعر اپنے اپنے محبوب کو حسن وشباب کا پیکر اور شرم وحیا کا مرقع و مجسمہ بنا کے پیش کرتا ہے۔زاہد کلیم اپنے حسین وجمیل محبوب کے ذکر کو بھی جمیل سمجھتے ہیں اور ساتھ ہی حسن کی اداؤں اور کچھ اداؤں کے روائتی خوف کا بھی شکار ہیں کہتے ہیں۔

زندگی کی سبیل کرتے ہیں
ان کا ذکر جمیل کرتے ہیں

(زاہد کلیم،نغمہ تارحیات،ص ۲۹)

ان حسینوں سے ڈر رہا ہوں کہ یہ
لو لگا کر ذلیل کرتے ہیں

(زاہد کلیم، نغمہ تارحیات، ص۴۱)

اٹھتی ہو مراد کی جنون خیز جوانی
ہر گام ہر عشوؤں کی چھاچھم تھی روانی

(زاہد کلیم، نغمہ تارحیات، ص۵۵)

محبوب کی ادائیں:

روٹھنا اور ناز و ادا دکھانا غزل کے موضوعات کا اہم پہلو ہے۔ زاہد کلیم کے ہاں بھی یہ موضوع بھرپور انداز میں موجود ہے بل کہ وہ اپنے محبوب کی ان اداؤں کو اپنے ہی لیے مختص کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

روٹھیں وہ بات بات پر ان کو مناؤں میں
پیدا ہوئی ان میں نزاکت مرے لیے

(زاہد کلیم، نغمہ تارحیات، ص۹۵)

وہ تھے شاداں اگر ستانے میں
لطف آیا ہمیں منانے میں

(زاہد کلیم، نغمہ تارحیات، ص۱۰۷)

ہے مزا چوٹ دل پر کھانے میں
اشک چھلکتے ہیں مسکرانے میں

(زاہد کلیم، نغمہ تارحیات، ص۱۲۳)

زاہد کلیم کے کلام میں حسن و عشق کے مقام کا ذکر کرتے ہوئے معروف نقاد کرنل غلام سرور کہتے ہیں۔:

''زاہد کلیم کے نزدیک عشق کا مقام بہت بلند ہے انسان کا دل اگر عشق سے خالی ہوتو اس کی زندگی اعلیٰ مقاصد سے عاری ہو جاتی ہے وہ زندگی کی ٹھوس حقیقتوں سے پنجہ آزما ہونا

جانتے ہیں۔تصورات کی دُنیا سے انھیں کوئی دل چسپی نہیں ، وہ حور وقصور اور فرشتہ و جبرائیل کی جلوہ آرائیاں اس جہان آب وگل میں دیکھنے کے خواہش مند ہیں۔اور راستے کے پیچ وخم سے پوری طرح آگاہ ہیں۔موصوف روشن مستقبل کے نقیب ہیں۔وہ ایسی صدا کے منتظر ہیں جس کی گونج عرش معلیٰ سے جاٹکرائے۔انھیں بلال حبشیؓ جیسے مؤذن کی تلاش ہے۔وہ اپنے درد کے درماں کے لیے کسی مسیحا کو تلاش میں ہیں۔جوان کے دکھوں کا علاج کرسکے۔''۱۳

اس حوالے سے اشعار ملاحظہ ہوں:۔

جانے کب مجھ پر مسیحا کی عنایت ہوگی
جانے کس روز مرے درد کا درماں ہوگا

(زاہد کلیم،آتش کدہ،ص۴۵)

شب کی بے درد سیاہی سے کہو اور بڑھے
میرا ہر زخمِ جگر، ماہ درخشاں ہوگا

(زاہد کلیم،آتش کدہ،ص۷۶)

زاہد کلیم کے ہاں جہاں حسن کی تاثیر مسلمہ ہے وہیں عشق کی قوت تسخیر بھی عیاں ہے۔وہ قوت عشق سے حسن کی تسخیر پر یقین رکھتے ہیں اور کہتے ہیں۔

اک زہرہ وش کے رُخ پر جو میری نظر گئی
وہ اشتیاق دیکھ کے میرا ٹھہر گئی

(زاہد کلیم،نغمہ تارحیات،ص۹۷)

اور حسن کی کارستانیوں اور اس کی حشر مانیوں کا تذکرہ یوں کرتے ہیں:

ٹھہری رہی تو نبض زمانہ رکی رہی

چلنے لگی تو دل پر قیامت گزر گئی

(زاہد کلیم،نغمہ تارحیات،ص۱۰۳)

علاوہ ازیں زاہد کلیم کے ہاں تصور حسن و عشق کے بے شمار خوب صورت اشعار مل سکتے ہیں جو کہ ان کی غزل کا بہترین آہنگ ہے۔

انسانی عظمت:

فکری جہات میں زاہد کلیم انسانیت اور انسان سے پیار کرنے والی شخصیت ہیں۔اس بنا پر ان کے کلام میں وہی اثر عیاں ہے۔وہ اپنی غزل میں انسانیت کا درس دیتے ہیں۔زندگی کے حقائق کی تلاش،مظاہر فطرت کی جستجو،انسان اوراس کا مقام،زندگی کی تلخیاں اوران کا مداوہ زاہد کلیم کی غزل کے موضوعات ہیں۔وہ انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کا بیان کرتے ہوئے محوسخن ہیں۔

اس کا اغیار راہ بنا ہوں میں اے ندیم

واقف نہیں ہنوز وہ مرے مقام سے

(زاہد کلیم،نغمہ تارحیات،ص۸۱)

عطاہوا تھا جنھیں حق سے خدمت ادراک

مٹار ہی ہے انھیں آج گردشِ افلاک

(زاہد کلیم،نغمہ تارحیات،ص۲۸)

زاہد کلیم کوانسانی اور خالق کائنات کے درمیان مقام ومرتبے کے فرق کا احساس پوری توانائی اور شعوری سچائی سے ہے چناں چہ وہ انسان کی بے حیثیتی اور خالق کائنات کی قدرت کاملہ کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

میں سنگ و خزف ہوں ، رزدگوہر تو ہے

میں قطرہ بے مایہ، سمندر تو ہے

(زاہد کلیم،نغمہ تارحیات،ص۸۱)

زاہدؔ کلیم کے ہاں انسانی عظمت اور کائنات کے نظام کا گہرا شعور پایا جاتا ہے، اپنے کلام میں انھوں نے جہاں انسان کے بلند مقام کا ذکر کیا ہے تو وہیں خالق کائنات کے بے پایاں قدرت اور قوت تخلیق کا ذکر بھی کیا ہے۔اس کے ساتھ ہی اُن کے ہاں انسانی رشتوں کا گہرا شعور بھی موجود ہے۔مخلصؔ وجدانی نے اُن کے کلام پر تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے لکھا ہے۔

''وہ انسانی زندگی اور انسانی رشتوں کو واضح کرنا چاہتے ہیں انھوں نے انسانی زندگی اور انسان حیات کے اسرار و رموز کو اس طرح موضوع بنایا ہے کہ زندگی کا ہر گوشہ اپنی رنگا رنگی کے ساتھ بے نقاب ہو جاتا ہے۔ذاتِ باری تعالیٰ کا تصور اس کی ذات کا عرفان انسان کا اس کے ساتھ رشتہ اور انسان کا اس ذات واحد سے قربت کے حصول کا خیال، ان سب پہلوؤں کی عکاسی زاہدؔ کلیم کے کلام میں بھرپور انداز میں کی گئی ہے۔'' ۱۴

قنوطیت:

اصطلاحاً قنوطیت سے مراد مایوسی، نا اُمیدی، افسردگی و یاسیت کا رویہ اور اس کا اظہار ہے۔قنوطیت ایک ایسے احساس اور طرزِ اظہار کا نام ہے جس کے زیر اثر انسان کائنات کے منفی پہلوؤں اور تاریک گوشوں کو ہی دیکھتا ہے اور اپنے کلام اور رویوں سے مایوسی اور قنوطیت کا اظہار کرتا ہے۔ابولاعجاز صدیقی کے مطابق:۔

''جہاں تک شعر و ادب کا تعلق ہے اشیا و واقعات کا تاریک پہلو دیکھنا، زندگی کو نا قابلِ زیست قرار دینا اور مستقبل کے بارے میں یاس و نا اُمیدی کا شکار ہو جانا قنوطیت کہلاتا ہے۔'' ۱۵

شاعر بعض اوقات اپنے تمام غم والم کو شعوری اور لاشعوری طور پر شعر کے قالب میں ڈھالتا ہے۔اپنی زندگی کی افسردگی، ناکامی اور دکھوں کو بیان کرنا قنوطیت کے زمرے میں آتا ہے۔ انگریزی زبان میں اس کے لیے Passivisim کا لفظ مستعمل ہے۔پروفیسر انور جمال کے مطابق۔

''زندگی اور اس کے متعلقات کے بارے میں نا اُمیدی، یاس اور افسردگی کا رویہ رکھنا قنوطیت کہلاتا ہے''۔۱۶

حقیقت میں زندگی اور کائنات روشن اور تاریک ہر دو پہلوں پر مبنی ہے۔ کائنات کا تمام حسن اپنی پہلوں کی بدولت قائم ہے، زندگی خوشی، غم، مسرت والم، محرومی و کامیابی، آنسو اور قہقہوں کا مرقع ہے۔ یہی رنگا رنگی اور تنوع زندگی کا حُسن ہے اور اسی بوقلمونی کو زندگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بہ صورت دیگر زندگی یکسانیت کا شکار ہو کر بے مزہ و بے کشش ہو جائے۔ جب شاعر اپنی زندگی کے اسی پہلو کو شعری قالب میں ڈھالتا ہے تو اسے شاعرانہ قنوطیت کا نام دیا جاتا ہے۔ جس کو پڑھ کر قاری پر بھی مایوسی کا احساس طاری ہو جاتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ دُنیا منفی اقدار کا مجموعہ ہے اور یہاں اثبات کا کوئی امکان نہیں، یعنی زندگی میں ہر طرف یاس، آنسو، مایوسی اور غم ہی ہیں۔ جہاں انسان کی کوئی خواہش و تمنا کے پورا ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ معروف مزاح نگار مشتاق احمد یوسؔفی ایسے طرزِ عمل کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

"قنوطی سے مراد ایسا آدمی ہے جس کے نزدیک قدرت نے انسانی آنکھ صرف رونے کے لیے بنائی ہے"۔ ۱۷

اُردو شاعری میں میر تقی میرؔ کو یاسیت اور قنوطیت کا شاعر کہا جاتا ہے تاہم صرف میرؔ ہی کو قنوطی و یاس پسند شاعر نہیں کہا جاسکتا۔ ناصرؔ کاظمی اور فانیؔ بدایونی (فانیؔ کو یاسیت کا امام مانا جاتا ہے) کے ہاں بھی زندگی کی تلخیاں اور دکھوں کا اظہار مایوسی سے بھرا ہوا ہے۔

زاہدؔ کلیم کے ہاں بھی مایوسی اور قنوطیت کا عنصر نمایاں ہے۔ زاہدؔ کلیم فطری طور پر تنہائی پسند انسان ہیں اور ان کے کلام سے بھی معاشرتی لوازمات سے دوری ظاہر ہو رہی ہے۔ ان کی شاعری میں غمِ ذات بھی ہے اور غمِ کائنات بھی۔ بل کہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ انھوں نے غمِ جہاں کو اپنی ذات کا غم سمجھا اور اسے بیان کیا۔

اُسلوبیاتی جائزہ:

اُسلوب کسی بھی فن کار کے مخصوص طریقہ اظہار کا نام ہے جس سے شاعر کی ایک الگ شناخت قائم ہوتی ہے۔ کسی بھی ادیب یا شاعر کی اسلوب سازی میں اُس کے ماحول اور معاشرت کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔ زاہدؔ کلیم کے اسلوب کی اگر بات کریں تو اِس میں غزل کا خاص مزاج اور تاثیر نظر آتی ہے۔ زاہدؔ کلیم کے اُسلوب سازی میں اُن کے وہ ایام خاص طور پر کارفرما ثابت ہوئے ہیں جو انھوں نے جوشؔ ملیح آبادی کی صحبت میں گزارے یہی وجہ ہے کہ زاہدؔ کلیم کا قلم خوب چلا اُن کے ہاں فارسیت اور عربیت اُن کے اسلوب کا خاص حصہ بن گئی۔ زاہدؔ کلیم نے چوں کہ اقبالؔ کو بہت گہرائی میں پڑھا یہی وجہ ہے

کہ اقبالؔ کی چھاپ بھی اُن کے کلام پر نظر آتی ہے ۔زاہدؔ کلیم کے کلام میں فارسیت کے استعمال کی ندرت اس قدر ہے کہ قاری سحر انگیزی میں مبتلا ہو جاتا ہے ۔زاہدؔ کلیم کے ہاں زبان پر دسترس اُن کے اسلوب کا خاصا ہے ۔ڈاکٹر صابرؔ آفاقی کے مطابق :۔

> ''نغمہ تارِ حیات کا مصنف زبان و بیان پر قدرت رکھتا ہے کلام میں کہیں انیسؔ ، اقبالؔ اور جوشؔ کا شکوہِ الفاظ نظر آتا ہے تو کہیں اخترؔ شیرانی اور حسرتؔ موہانی کی حلاوت بیان ملتی ہے ۔۔۔زاہدؔ کلیم موجودہ نسل کا شاعر ہے اُس کا لہجہ خطیبانہ اور انداز ناصحانہ ہے'' ۔۱۸

زاہدؔ کلیم کے اُسلوب میں اسلامی طرز معاشرت اور اسلامی فکر بھی عیاں ہے ان کے ہاں مذہب اسلوب کا بنیادی حصہ نظر آتا ہے اس حوالے سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں :۔

کون اتنا کرم گُستر و غم خوار ہے زاہدؔ
واللہ جوانی کے یہ خوابوں کی تڑی تھی!

(زاہد کلیم ،نغمہ تارحیات ،ص ۲۷)

عمر مسیح ؑ و خضر کے آگے بہ کروفر
خنداں ، رواں دواں تھی مِری عمر مستعار

(زاہد کلیم ،نغمہ تارحیات ،ص ۱۱۳)

اللہ رے ، اس شوخ کی دُزدیدہ نگاہی
لے سانس تو معلوم ہو لیتی ہے جماہی

(زاہد کلیم ،نغمہ تارحیات ،ص ۱۴۱)

ڈاکٹر صابرؔ آفاقی

مختصر حالاتِ زندگی:

آزاد کشمیر کے ادبی منظرنامے میں ڈاکٹر صابرؔ آفاقی نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ آزاد کشمیر کے ضلع مظفرآباد کے مضافاتی گاؤں گوہاڑی میں ۹ مارچ ۱۹۳۳ء کو سردار چودھری علی محمد کے گھر پیدا ہوئے۔ والدین نے نام ''سردار احمد الدین ''رکھا۔ پروفیسر مسرت صبوحی کے مطابق:

''صابرؔ آفاقی موضع گوہاڑی علاقہ لچھراٹ تحصیل مظفرآباد میں ۹ مارچ ۱۹۳۳ء کو پیدا ہوئے۔ والد نے نام سردار احمد الدین رکھا لیکن انھوں نے اپنا قلمی نام صابرؔ آفاقی رکھا''۔۱۹

صابرؔ آفاقی گجروں کی پھالڑہ گوت سے تعلق رکھتے تھے۔ صابرؔ آفاقی کے والد عربی، فارسی اور پنجابی زبان پر عبور رکھنے کے علاوہ عالم دین بھی تھے جب کہ شاعری سے بھی شغف تھا۔ یہی وجہ تھی کہ صابرؔ آفاقی کو گھریلو ماحول ہی ایسا میسر آیا جس میں ادب اور کتابیں عام تھیں۔ گھر میں عربی اور فارسی کتب موجود تھیں جس کی وجہ سے صابرؔ آفاقی نے ابتدائی زندگی میں ہی گلستان و بوستان جیسی کتابوں کا مطالعہ کرنا شروع کر دیا۔ بچپن میں ہی کئی اشعار زبانی یاد کر لیے۔ صابرؔ آفاقی چوں کہ ایک دیہات سے تعلق رکھتے تھے اس لیے مویشی پالنا ہر گھر میں لازمی امر تھا۔ صابرؔ آفاقی نے بھی بچپن میں بھیڑ بکریاں چرائیں اور کھیتی باڑی بھی کی۔

صابرؔ آفاقی نے تعلیم کے حصول کے لیے والد کی ایما پر ہزارہ کا سفر کیا۔ ہزارہ جانے کی بنیادی وجہ علاقے میں تعلیمی ادارے کا نہ ہونا تھا۔ ہزارہ اور پنجاب کے مختلف تعلیمی اداروں میں رہ کر صابرؔ آفاقی نے اپنے وقت کے نام وَر اَساتذہ سے فیض حاصل کیا۔ عبدالحی علوی، ڈاکٹر سید عبداللہ، احسانؔ دانش جیسے قابل ترین لوگوں سے اکتسابِ علم حاصل کرنے کے بعد ۱۹۵۱ء میں صابرؔ آفاقی نے واپس اپنے علاقے میں قدم رکھا۔ ایم۔ اے اُردو، ایم۔ اے فارسی، بی ایڈ وغیرہ کی اسناد حاصل کرنے کے بعد صابرؔ آفاقی ۱۹۶۷ء میں حکومت ایران کے اسکالرشپ پر پی ایچ ڈی کے لیے ایران چلے گئے۔ جس وقت صابرؔ آفاقی نے ایران کا سفر کیا اس دوران وہ آزاد جموں و کشمیر یونی ورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدے پر تعینات تھے۔ ایران جانے کے لیے ان کو اس شرط پر رخصت ملی کہ اس عرصے کی تنخواہ ان کو نہیں ملے گی۔ صابرؔ آفاقی نے بلا تنخواہ رخصت لی اور تہران یونی ورسٹی میں پی ایچ ڈی کے لیے رختِ سفر باندھا۔ ایران میں قریباً چار سال تک قیام رہا۔ کشمیر کی قدیم ترین

تاریخ ''راج ترنگنی'' آپ کے پی ایچ ڈی کے مقالے کا موضوع رہی۔۱۹۷۲ء میں وطن واپسی ہوئی۔

صابرؔ آفاقی نے قریب قریب اُردو شاعری کی تمام اصناف پر طبع آزمائی کی اس کے علاوہ خود کو مورخ، نقاد اور محقق کی حیثیت سے منوایا۔ ڈاکٹر صابرؔ آفاقی نے اُردو، پنجابی، فارسی اور گوجری زبانوں میں لکھا۔ ان کی قریباً ۴۵ کتب شائع ہو چکی ہیں۔

اُردو تصانیف میں شہر تمنا، طلوعِ سحر، خنہ ہائے بے جا، ثنائے بہا، زمرمہ روح، جلتے کشمیر، عکسِ کشمیر، نئے موسموں کی بشارت، سارے جہاں کا درد، اقبالؔ اور کشمیر، مظفر آباد وغیرہ اہم ہیں۔ فارسی تصانیف میں گلہائے کشمیر، در جستجو سارہ ای دیگر اور شمس بہار وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ گوجری کتب میں اتھروں، ہاڑا، پھل کھیلی، گوجری ادب، کیسر کیاری، گوجری گرائمر، سانجو کھلاڑو وغیرہ مشہور ہیں۔ صابرؔ آفاقی نے اپنی بھر پور علمی و ادبی زندگی گزاری اور ۱۰ اپریل ۲۰۱۰ء کو اسلام آباد کے پمز اسپتال میں انتقال ہوا۔ اسلام آباد میں ہی آپ کو دفن کر دیا گیا۔

صابرؔ آفاقی کی غزل

صابرؔ آفاقی نے یوں تو ادب کے کئی پہلوؤں میں نام کمایا لیکن آپ کی غزل میں آپ کا فن بامِ اوج پر دکھائی دیتا ہے۔ صابرؔ آفاقی کی شاعری کے حوالے سے انورؔ مسعود لکھتے ہیں۔

> ''صابرؔ آفاقی کا طرۂ امتیاز ان کا انتہائی ثروت مند علمی پس منظر ہے آپ بہ یک وقت فارسی، اردو، پنجابی اور گوجری پر عبور رکھتے ہیں۔ شاعری کی پوری روایت ان کی نظر میں ہے۔'' ۔۲۰

صابرؔ آفاقی نے واقعتاً کم عمری سے ہی شعر کے فن کو پہچانا۔ ابتدا سے ہی شعر موزوں کرنے کے فن سے آشنا ہو چکے تھے۔ صابرؔ آفاقی کی یہی کم عمری کی مشق سخن تھی کہ آگے چل کر جس نے ان کو نہ صرف ملکی بل کہ بین الاقوامی سطح پر بھی ایک بڑے شاعر کی حیثیت سے متعارف کروایا۔ وہ ابتدا میں تو مذہبِ اسلام کے ماننے والے تھے ان کا گھرانا مذہبی گھرانا تھا لیکن ایران میں قیام کے وقت آپ نے بہائی مذہب اختیار کر لیا۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی اس حوالے سے بتاتے ہیں۔

> ''میں ایران میں صابرؔ آفاقی کے ساتھ رہتا تھا اس وقت انھوں نے اپنا مذہب بدلنے کے بارے میں غور و فکر کے ساتھ ساتھ عملی کام بھی شروع کر دیا۔ جس پر میں نے ان کو بہت

سمجھایا لیکن وہ باز نہ آئے۔ مجھے اس وقت مجبوراًان سے الگ ہونا پڑا جب وہ مجھے بھی تبلیغ

دینے پر اتر آئے''۔۲۱

اس سب کے باوجود صابرؔ آفاقی انسانیت کو اپنا مذہب بتاتے ہیں۔ ہر بڑے شاعر کی طرح وہ بھی محبت اور دوستی کی بات کرتے ہیں۔

میرا مذہب ہے انسان سے دوستی
ہو مبارک تمھیں دشمنی، دوستو

(صابرؔ آفاقی، شہرِ تمنا، ص ۸۷)

ڈاکٹر صابرؔ آفاقی کے فنی کمالات میں نادر تشبیہات اور استعارات کے علاوہ صنائع بدائع بھی پورے اہتمام کے ساتھ ملتے ہیں ان کے پاس تشبیہات بھی وہی ہیں جو خطہ کشمیر سے ہے مثال کے طور پر:

اتر کے شہر میں آیا تھا کہساروں سے
مجھے جو شخص ملا تھا وہ برف جیسا تھا

(صابرؔ آفاقی، شہرِ تمنا، ص ۴۲)

چوں کہ سرد ہونا بے وفائی کی علامت بھی سمجھا جاتا ہے اس لیے صابرؔ آفاقی نے اس شعر میں خوب صورتی کے ساتھ محبوب کی بے وفائی کو لفظوں کا لبادہ پہنا کر پیش کیا ہے۔ برف اور کہسار کا کشمیر سے بھی گہرا تعلق ہے۔ گویا یہ بات بلا تامل کی جاسکتی ہے کہ صابرؔ آفاقی نے اپنی دھرتی سے ہی تشبیہات اور استعارے لیے ہیں۔ اس طرح تشبیہات کے حامل یہ اشعار دیکھیے۔

شاید ابھی باقی ہے رمق آب ہوس کی
کپڑے کی طرح دھوپ میں مدت کے پڑا ہوں

(صابرؔ آفاقی، شہرِ تمنا، ص ۸۸)

اٹھاتے ہیں وہ یوں رخ سے نقاب آہستہ آہستہ
عیاں ہو ابر سے جوں ماہتاب آہستہ آہستہ

(صابرؔ آفاقی، شہرِتمنا، ص۷۹)

صابرؔ آفاقی نے تشبیہ میں عام روایات سے ہٹ کر ایک الگ اور اچھوتا انداز اپنایا ہے۔ انھوں نے تشبیہات و استعارات کے اس نظام کو شعر میں یوں رائج رکھا ہے جیسا کہ غزل اس کی متقاضی ہے۔ بادلوں کی اوٹ سے چاند کا نمودار ہونا کس قدر خوب صورت تشبیہ ہے۔ قاری جب اس بات کو محسوس کرتا ہے تو بے اختیار اس سے حظ اٹھاتا ہے۔

علم بدیع کی مثال زیورات کی سی ہے۔ جس طرح زیورات ظاہری حسن و خوب صورتی کا سبب بنتے ہیں ایسے ہی علم بدیع کلام میں ندرت اور خوب صورتی پیدا کرتا ہے۔ صابرؔ آفاقی کے کلام میں صنعتوں کا استعمال اگر چہ کم ہے۔ لیکن جو بھی کیا ہے وہ بہت احتیاط کے ساتھ کیا ہے۔ لفظوں کی حرمت کو مجروح نہیں ہونے دیا۔ صابرؔ آفاقی کے کلام میں صنعت تضاد، صنعت تجنیس مضارع اور مراعات النظیر وغیرہ کے حامل اشعار ملاحظہ ہوں:۔

جو دست وپا نے دیا ہے جواب تو دیکھا
کہ موج تند ، گہر سے کنارے بھرنے لگے

(صابرؔ آفاقی، سارے جہاں کا درد، ص۲۱)

جہاں پر رہزن بیٹھا ہوا تھا
وہاں اب راہبر بیٹھا ہوا ہے

(صابرؔ آفاقی، سارے جہاں کا درد، ص۲۸)

درج بالا اشعار میں صنعت تضاد کو واضح دیکھا جا سکتا ہے۔ دست، پا، موج، کنارہ، رہزن، راہبر کے مابین تضاد موجود ہے۔

صنعت تجنیس ایسی صفت ہے جس میں ایک ہی لفظ کا استعمال ہو مگر الگ الگ معنی دے رہا ہے۔ اسی سے صنعت تجنیس مضارع ہے۔ تجنیس مضارع کے مطابق تجنیس کے دونوں الفاظ میں صرف ایک حرف کا فرق ہو مثال کے طور پر پرسوں اور برسوں میں ''ب'' اور ''پ'' کا فرق ہے۔ اس طرح ''رب'' اور ''کب'' میں ''ر'' اور ''ک'' کا فرق تجنیس

مضارع ہے۔صاؔبر آفاقی کے ہاں تجنیس مضارع کی مثال دیکھیے۔

جو پوچھٹی تو بدن اس کا برف جیسا تھا
لہو بہار کی نسبت سے حرف جیسا تھا

(صاؔبر آفاقی،شہرتمنا،ص۴۲)

آج کہاں ہیں جدت والے!
جذبے اگلی حدت والے

(صاؔبر آفاقی،سارے جہاں کا درد،ص۷۷)

کسی کی خاطر جاؤں میں گوہاڑی کے گاؤں
اب تو مجھ سے روٹھ گئی ماں کی ٹھنڈی چھاؤں

(صاؔبر آفاقی،سارے جہاں کا درد،ص۱۵۳)

درج بالا اشعار میں تجنیس مضارع برف،حرف،جدت،حدت،گاؤں اور چھاؤں کی صورت میں ہیں۔ان تمام الفاظ میں حرف ایک ایک حرف کا فرق ہے۔

ان فنی کمالات کے علاوہ صاؔبر آفاقی نے صفت مراعات النظیر کے عمدہ شعر نکالے ہیں۔مراعات النظیر کے حامل صاؔبر آفاقی کے چند اشعار دیکھیے۔

مردے کو ڈھونڈتا ہے مسیحا کہ ''قم'' کہے
لیکن سوال یہ ہے یہاں زندہ کون ہے

(صاؔبر آفاقی،سارے جہاں کا درد،ص۱۶)

مردہ،مسیحا،قم،زندہ۔عیسیٰؑ مردے کو قم کہہ کر زندہ کر دیتے تھے۔یہاں حضرت عیسیٰؑ کی نسبت سے مردہ زندہ اور قم کے الفاظ مراعات النظیر کی بہترین مثال ہیں۔

کھلا تھا میرے صحن میں جو پھول اک گلاب کا
چمن کو سب ملا حسیں وہی گلاب دے گیا

(صابرؔ آفاقی، شہرِ تمنا، ص۴۰)

چمن کی رعایت سے گلاب، پھول کے الفاظ مراعات النظیر ہے۔صنعت ترافق، ایسی صفت ہے جس میں مصرعے کے بدلنے سے مفہوم پر فرق نہ پڑے۔ اردو شعری روایت میں اقبالؔ، غالبؔ سمیت بڑے شعرا کے ہاں یہ صنعت ملتی ہے۔ یہ حقیقت اپنی جگہ کہ شاعر جب شعر کہتا ہے تو اس وقت اس کے ذہن میں ایسا کوئی خیال نہیں ہوتا کہ وہ باقاعدہ ارادے کے تحت صنعتوں کا استعمال کرے۔ تاہم کسی بھی شاعر کے ہاں صنعتوں کا خوب صورت استعمال اس شاعر کے فنی کمال کا اعتراف ضرور ہے۔صابرؔ آفاقی کے ہاں جہاں دیگر صنعتیں ملتی ہیں وہیں صنعت ترافق بھی موجود ہے۔

عجیب آدمی تھا وہ، ملا تھا کل جو راہ میں
وہ میرے قلب وذہن کو اک انقلاب دے گیا

(صابرؔ آفاقی، شہرِ تمنا، ص۴۰)

اب اگر اس شعر کو مصرعوں کی ترتیب بدل کر بھی پڑھیں تو مفہوم فوت نہیں ہوگا نہ ہی پڑھنے میں کوئی دقت محسوس ہو گی۔

وہ میرے قلب و ذہن کو اک انقلاب دے گیا
عجیب آدمی تھا وہ ، ملا تھا کل جو راہ میں

اس طرح ترافق کا حامل ایک اور شعر دیکھیں:

نہ گاؤں میں ہے سکون کوئی
نہ شہر امن و امان میں ہیں

(صابرؔ آفاقی، سارے جہاں کا درد، ص۷۸)

اب اگر اس شعر کی ترتیب الٹ کر دیکھیں تو اس کو معنی و مفہوم بھی برقرار رہے گا اور پڑھنے میں بھی مسئلہ درپیش نہ رہے گا۔

نہ شہر امن و امان میں ہیں
نہ گاؤں میں ہے سکون کوئی

(صابرؔ آفاقی، سارے جہاں کا درد، ص۲۹)

صابرؔ آفاقی کے پاس مجاز مرسل کے حامل شعر بھی موجود ہیں۔ مجاز مرسل سے بھی شعری حسن میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور قاری کے لیے باعث لطف وتسکین ہوتا ہے۔ درج ذیل شعر ملاحظہ ہو جس میں کل بول کر جز مراد لی گئی ہے۔

تم آفاقی کو سادہ مت سمجھنا
زمانہ دیکھ کر بیٹھا ہوا ہے

(صابرؔ آفاقی، سارے جہاں کا درد، ص۲۹)

ڈاکٹر صابرؔ آفاقی ایک قلم کار ہیں جن کی فکری سطح بھی ان کے فن کی طرح مضبوط ہے۔ سید ضمیرؔ جعفری لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر صابرؔ آفاقی ۔۔۔ کا کلام پختہ فکر ہے۔ وہ تخلص میں نہیں، اپنی شاعری میں بھی آفاقی ہیں کہ کائنات کی دھوپ چھاؤں ہی ان کا موضوع سخن ہے۔'' ۔۲۲

صابرؔ آفاقی کے کلام میں ان کی فکری سطح مضبوط ہے۔ وہ سارے جہاں کے درد کو محسوس کیے ہوئے ہیں۔ امن، محبت، صلح، بھائی چارہ اور انسانیت کے متلاشی صابرؔ آفاقی کے کلام میں جگہ جگہ مسائل حیات اور مسائل معاشرہ پر اپنے جذبات کا اظہار ملتا ہے۔ احسانؔ دانش مرحوم کے مطابق:

''ڈاکٹر صابرؔ آفاقی کی وسعت خیال اور بلندی فکر کا اندازہ وہی لوگ زیادہ کر سکیں گے جو دن رات علم وادب کی ٹوہ میں رہتے ہیں اور ادب کو ایک مذہب کی طرح لہو ولعب اور اختلال اور ابتذال سے پاک دیکھنا چاہتے ہیں۔۔۔۔ صابرؔ آفاقی کی شاعری میں کشمیر کے چشموں میں نہائے نغمے بھی ہیں، سفید احرام باندھے ہوئے کوہساروں کی سنجیدگی بھی اور سیاہ برقع پوش راتوں کی متانت بھی۔'' ۔۲۳

صابرؔ آفاقی کے پاس فکری سطح پر مزاحمتی انداز بھی واضح ہے۔ چوں کہ صابرؔ آفاقی کا تعلق خطہ کشمیر سے تھا۔ کشمیر کی دھرتی گذشتہ سات دہائیوں سے ظلم وبربریت کی چکی میں پستی چلی آ رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے شعرا اور ادبا کے

پاس اس دھرتی کی محبت رگوں میں خوں کی روانی کی طرح موجزن ہے۔یہی محبت ہے جو بغاوت پر اکساتی ہے۔جو حساس اور درد مند انسان کشمیر میں ظلم کے بازار کو گرم دیکھتا ہے تو بھلا اس سے کیوں کر خاموش رہا جا سکتا ہے؟ کشمیریوں کی ساری کی ساری تاریخ مزاحمت اور جہاد کی تاریخ ہے۔اس خطے کے باشندے اپنے حقوق، آزادی اور بقا کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ یہاں کے ادب میں مزاحمتی عناصر کا در آنا فطری عمل ہے۔ یہاں کی شاعری میں مزاحمتی رنگ کے پنپنے اور مقبول ہونے کی کئی ایک وجوہات ہیں۔ پروفیسر مسرت صبوحی کی مطابق:

''جو ظلم و جبر کشمیر میں ہو رہا ہے، حساس طبیعت ادیبوں کے مزاج پر خود بہ خود فوراً اثر کرتا ہے۔ وہ دانش ور جو مزاحمتی ادب کی تخلیق میں حصہ لیتے ہیں ان کا تاریخ میں انتہائی اہم کردار ہوتا ہے۔''۔۲۴

کشمیر کے سبھی شاعروں نے آزادیِ کشمیر کے تناظر میں بہت کچھ لکھا۔ان کا لکھا ہوا تحریک آزادیِ کشمیر میں ایک نئی روح پھونک دیتا ہے اور روز بہ روز کشمیریوں کے جذبۂ حق خود ارادیت میں مزید تیزی آتی جا رہی ہے۔

صابرؔ آفاقی کے ہاں بھی مزاحمتی شاعری کی قطعاً کوئی کمی نہیں ان کے ہاں ایک سے بڑھ کر ایک بڑا شعر مزاحمتی ادب کا حامل ملتا ہے۔ڈاکٹر صابرؔ آفاقی نے بلا شبہ کشمیریوں کے احساسات کی ترجمانی کی ہے۔انھوں نے آزادی کی شمع کو روشن تر کرنے کے لیے شعر و سخن کے جو دیپ جلائے ہیں وہ اپنی مٹی سے محبت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

جو ایک بم کہیں ڈھلتا ہے کارخانے میں
ہزار نوحے زمیں سے سنائی دیتے ہیں

(صابرؔ آفاقی، شہر تمنا، ص۲۱)

صابرؔ آفاقی کا مشاہدہ ہے کہ وہ اس بات سے واقف تھے کہ ہماری اس میں بارود نے تباہی مچا رکھی ہے۔ایک بم پھٹنے سے کتنے ہی گھروں میں صف ماتم بپا ہو جاتی ہے۔وہ بموں کی اس فضا سے خائف تھے۔صابرؔ آفاقی کا یہ ایمان ہے کہ بشر کو نفرت سے نہیں بل کہ محبت سے زیر کیا جا سکتا ہے۔وہ محبت ہی کا پرچار کرتے ہیں۔

ہمیں یقین کہ محبت سے ہے عروج بشر
انھیں گمان کہ یہ سب اوج بم سے ملتے ہیں

(صابرؔ آفاقی، شہر تمنا، ص۲۲)

آزاد کشمیر میں بدلتی ہوئی سماجی اقدار کی وجہ سے بھی یہاں کے شعرا کو سماجی سطح پر مزاحمتی انداز اپنانا پڑا۔ یہ شاعری مزاحمت تھی اس نظام کے خلاف جس نظام میں نفرت ہی کا بیج بویا جا رہا ہے۔ یہ مزاحمت ہے ان درندوں کے خلاف جنھوں نے کشمیر کے بے گناہ مسلمانوں کے خون سے جہلم (وتستا) کے پانی کو لال کر دیا ہے۔ یہ مزاحمتی شاعری جبر کے کسی نظام اور کسی رویے پر ضرب کرتی ہے۔ آزاد کشمیر کی غزل میں مزاحمتی عناصر کی روایت قریب اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ یہاں اردو شاعری کی روایت قدیم ہے۔ صابرؔ آفاقی کی غزل میں بھی یہ مزاحمتی عناصر جا بہ جا ملتے ہیں۔ مثالیں دیکھیں:

زنداں کا در کھلے گا یہ ایماں ہے دوستو
گو اب کڑی بہت شبِ ہجراں ہے دوستو

(صابرؔ آفاقی، شہر تمنا، ص۱۳۶)

کیسے وہیں عدو کی رعونت کے سامنے
جن کے دلوں دولتِ ایماں ہے دوستو

(صابرؔ آفاقی، شہر تمنا، ص۱۳۶)

عدو نے پاؤں جو توڑے تو معجزہ یہ ہوا
کہ سر کے بل تیری جانب جبیں چلنے لگی

(صابرؔ آفاقی، سارے جہاں کا درد، ص۱۹)

صابرؔ آفاقی جہاں دشمن کے خلاف برسرِ پیکار ہیں وہیں وہ اس بات سے پر امید بھی ہیں کہ ایک دن ضرور اس زمین سے غیر کا تسلط ختم ہوگا۔

کوئی دن خالی نہ جائے خواب سے
ایک دن تعبیر نکلے گی ضرور

(صابرآفاقی، سارے جہاں کا درد، ص۷۳)

ڈاکٹر صابرآفاقی نے کشمیری ہونے کے ناتے اپنے ہم وطنوں کے کرب کو بہت شدت سے محسوس کیا ہے۔ان کے شعروں میں بھارتی جارحیت اور جبر کے خلاف جو مزاحمت موجود ہے وہ غمازی کرتی ہے کہ ان کے سینے میں بھی جو دل دھڑکتا تھا اس کی دھڑکنوں میں آزادیِ کشمیر کی ہی لے سنائی دیتی تھی۔یہی مزاحمت صابرآفاقی کے ہاں ادب کا حصہ بن جاتی ہے۔

بار بار اٹھتا ہے غنچوں کو ملنے کے لیے
ہاتھ گلچین جفاکش کا شل ہو جائے

(صابرآفاقی ،شہرتمنا،ص۱۶۰)

آؤ اے ہم وطنو ایک بھی ہو کر دیکھیں
جھگڑا کشمیر کا ممکن ہے حل ہو جائے

(صابرآفاقی ،شہرتمنا،ص۱۶۰)

ڈاکٹر صابرآفاقی کے ہاں مزاحمت کی علامتیں سماج کے وہ عناصر ہیں جو جبر پر مامور ہیں۔کوتاہ قد اور بونے ہیں اور یہ بونے سرکشیدہ لوگوں کے سروں کے درپے ہیں۔لہٰذا ان کے ہاں قد وقامت مزاحمتی شاعری کا ایک بلیغ استعارہ ہے۔علاوہ ازیں وہ اپنی غزلیات میں خواب دیکھنے کی آزادی مانگتے ہیں اور یہ خواب بھی ان کے ہاں مزاحمت کی ایک اہم علامت ہے۔

جہاں صابرآفاقی نے مزاحمت کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا وہیں ان کے ہاں رجائیت کے پہلو بھی نمایاں ہیں۔آزاد کشمیر کی اردو شاعری میں امید و رجائیت کا بھی خاطر خواہ اثر موجود ہے۔ جہاں آزاد کشمیر کے دیگر شعرا نے کٹھن سماجی حالات میں امید و آس کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا وہاں ہی صابرآفاقی نے بھی امید کو تھامے رکھا۔ یہ الگ بات کہ صابر آفاقی نے جس ماحول میں آنکھ کھولی اس میں مشکلات اور تکالیف کی کوئی کمی نہ تھی لیکن ان سب باتوں کے باوجود ان کے

کلام میں امید کی لو کبھی بھی مدہم ہوتی نظر نہیں آتی۔ان کے کلام کے مطالعے سے اس بات کا بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے کلام میں امید ور جائیت کے مضامین زیادہ نمایاں طور پر سامنے آتے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ تحریک آزادیٔ کشمیر کی طویل اور تھکا دینے والی مسافت کے باوجود یہاں کے شعرا نے استقلال اور امید کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا۔اس استقلال نے شعرائے کشمیر کے اندر ایک ایسی فکری روایت پیدا کی ہے کہ جس نے شعری فکر میں رجائیت کے لہجے کو ابھارنے میں مدد فراہم کی ہے۔صابر آفاقی کے ہاں امید ور جائیت کی مثال دیکھیں:

سینۂ خاک کو مہکائیں گے مانند شمیم
وسعت چرخ پہ پرواز کریں گے ہم لوگ

(صابر آفاقی ،شہر تمنا،ص۱۳۸)

جگنو نے کہا مجھ سے مایوس نہیں ہونا
سورج کو نکلنے میں کچھ دیر نہیں لگتی

(صابر آفاقی ،سارے جہاں کا درد،ص۵۲)

صابر آفاقی کے ہاں امید کا پہلو بہت واضح اور نمایاں ہے۔ وہ جو جب کبھی حوصلہ چھوڑنے لگتے ہیں تو ان کے سامنے ہمت اور امید کھڑی ہو جاتی ہے۔جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں کہ مجھے ایک جگنو بھی سہارا دیتا ہے کہ کبھی مایوس نہ ہوتا۔ناصر کاظمی جو میرِ ثانی اور دکھ و کرب کے شاعر کہلاتے ہیں ان کے ہاں بھی امید ور جائیت کے اشعار مل جاتے ہیں تو صابر آفاقی تو پھر بھی مردِ کوہستانی تھے۔ان کے ہاں پہاڑ جیسا حوصلہ موجود تھا۔ وہ کیوں نہ اس بات کی امید کرتے کہ وہ ایک روز غم کے بادل چھٹ جائیں گے اور خوشی کی پھوار برسے گی چناں چہ وہ لکھتے ہیں:

جن راہوں میں خاک اڑتی تھی، سناٹا تھا ہر سو
ان راہوں میں آج رواں ہیں ،شوق کے قافلے اور

(صابر آفاقی ،سارے جہاں کا درد،ص۵۹)

صابر آفاقی اللہ کی ذات پر کامل یقین رکھنے کا درس دیتے ہیں۔ان کا ایمان ہے کہ اللہ ہر کسی کے بگڑے کام ضرور بناتا ہے۔بس ذرا یقین مضبوط ہونا چاہیے وہ اس بات کو بالکل واضح انداز میں بیان کرتے ہیں کہ خدا ہی ہر کسی کے

بگڑے کام بناتا ہے۔ ہمارے بیڑے کو بھی وہی پار لگائے گا۔ لیکن ہمیں بے یقینی سے آنکھیں چرا کر یقین کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ وہ کہتے ہیں:

وہی کام سارے بنائے گا تیرے
خدا پر یقین رکھ ارے بے یقینا!

(صابرؔ آفاقی، سارے جہاں کا درد، ص ۶۸)

صابرؔ آفاقی کی رجائیت اور یقین کا حامل یہ شعر دیکھیں:

یقین کرو کہ زمانہ بدلنے والا ہے
نوشتے صاف یہ دیوار و در کے دیکھتے ہیں

(صابرؔ آفاقی، سارے جہاں کا درد، ص ۸۰)

آج کی صبح نئے روز کی لاتی بشارت
ذرہ ذرہ ہے منور تو ضیا بار شفق ہے

(صابرؔ آفاقی، شہرِ تمنا، ص ۵۷)

جہانِ تازہ پیدا ہو رہا ہے
اگر دیکھی کوئی میری نظر سے

(صابرؔ آفاقی، شہرِ تمنا، ص ۶۷)

صابرؔ آفاقی کے ہاں رجائیت کی اور حوصلے کی اس سے بڑی مثال کیا ہوگی کہ وہ خود اعتراف کر رہے ہیں کہ ساٹھ سال کی عمر میں بھی ان کے حوصلے اور ہمت میں فرق نہیں آیا اس بات کا اعتراف کسی خوب صورتی سے کر رہے ہیں ملاحظہ ہو:

صابرؔ بوڑھا تو ہی ہے عمر ہے اس کی ساٹھ
فرق نہ آیا جیون میں اب بھی وہی ٹھاٹھ

(صابرؔ آفاقی، شہرِ تمنا، ص ۱۵۶)

رجائیت کے علاوہ صابرؔ آفاقی کے ہاں زندہ دلی اور مزاح بھی کم نہیں۔ اردو شاعری میں مزاح کی بحث نئی نہیں

ہے۔آج مزاحیہ شاعری ایک الگ صنف کا درجہ اختیار کر چکی ہے۔غالبؔ ہو یا نظیرؔ ظرافت اور مزاح سے کسی کا کلام خالی نہیں۔اکثر شعرا کے ہاں ظرافت ارادی طور پر موجود ہے۔اردو ادب کے آغاز میں مزاحیہ شاعری اور ظرافت کی روایت زیادہ مستحکم نہ سہی لیکن ایک مضبوط بنیاد ضرور ہے۔اس بنیاد کا ہی شاخسانہ ہے کہ عہدِ موجود میں بڑے بڑے مزاح گو موجود ہیں۔صابرؔ آفاقی جس خطے سے تعلق رکھتے ہیں یہاں ماضی میں مزاح کی روایت زیادہ پھیلی ہوئی نظر نہیں آتی۔آزرؔ عسکری ایک باضابطہ مزاح گو کے روپ میں سامنے آئے۔صابرؔ آفاقی نے اپنی خداد صلاحیتوں کے بل بوتے پر جہاں سنجیدہ شاعری میں الگ شناخت قائم کی وہیں ان کے ہاں مزاح کا عُنصر بھی موجود ہے۔صابرؔ آفاقی نے باقاعدہ مزاحیہ شاعری کی جس کا ثبوت ان کا مجموعہ کلام ''خندہ ہائے بے جا'' کی صورت میں موجود ہے۔اس مجموعے میں صابرؔ آفاقی کا مزاحیہ آہنگ بالکل واضح ہے۔انورؔ مسعود کے مطابق:

''ڈاکٹر صابرؔ آفاقی کی شاخِ سخن اگر ایک طرف سنجیدہ شاعری سے مالا مال ہے تو دوسری طرف اس پر مزاح وظرافت کے پھولوں کی بہار بھی دیدنی ہے۔''خندہ ہاے بے جا''اسی بہار کا مرقع ہے۔'' ۲۵

صابرؔ آفاقی کی تخلیق زندگی کا ایک پہلو اُن کی مزاح نگاری بھی ہے۔ایک سنجیدہ شاعر، مورخ، نقاد، محقق اور مترجم کے طور پر پہچان رکھنے والے صابرؔ آفاقی جب مزاحیہ شاعری میں طبع آزمائی کرتے ہیں تو اس سے ان کی شخصیت کا ایک دل چسپ پہلو عیاں ہوتا ہے۔تحقیق اور تنقید جیسے سنجیدہ اور سپاٹ مضامین سے ہٹ کر کسی اکیلے شخص سے مزاح نگاری کی توقع کرنا ایک مشکل امر ہے ایک ایسا شخص جس کے ہاں سنجیدہ موضوعات ہوں۔جس کے ہاں تنقید جیسی پے چیدہ صنف ہو۔جس کے ہاں معاشرے کے روز نازک خیالات ہوں۔لیکن صابرؔ آفاقی نے نہ صرف ایسا کر کے دکھایا بل کہ ان کی مزاحیہ شاعری کا بڑے بڑے مزاح نگاروں کو معترف ہونا پڑا۔

صابرؔ آفاقی کے رنگ مزاح کی خاص بات لفظوں کی صوتی اور معنوی اعتبار سے پہلو داری ہے۔وہ الفاظ کی صوتی مماثلتوں سے نئے نئے مضامیں پیدا کرنے کا ملکہ رکھتے ہیں اور ایک ایک لفظ کے استعمال میں یوں مہارت دکھاتے ہیں کہ وہ لفظ کئی پہلوؤں سے معنی دیتا ہے جیسا کہ انورؔ مسعود لکھتے ہیں:

''ایک عالم ہونے کے ناتے ڈاکٹر صابرؔ آفاقی لفظ کی صوتی اور معنوی حرمت کے سلسلے

میں بے حد حساس واقع ہوئے ہیں۔۔۔ڈاکٹر صابرؔ آفاقی نے بعض الفاظ کے معنوی سفر کا بھی خوب سراغ لگایا ہے۔ بالائی کا لفظ کبھی دودھ سے جڑا ہوتا تھا اور اب آمدن کے ساتھ جڑ کر رہ گیا ہے۔اسی طرح تذکیر و تانیث کی بھی بڑی دل چسپ صورتیں پیدا ہوئی ہیں۔ ''ویر'' کی مؤنث ''ویرانی'' ڈاکٹر صابرؔ آفاقی کو سوجھ سکتی ہے۔گرداورں اور پٹواریوں کی بدعنوانیوں کی اصلاح کے لیے انسدادِ منشیات (منشیوں کا انسداد) کی ترکیب سے کیا عمدہ لفظی مزاح پیدا ہوا ہے۔''۲۶

صابرؔ آفاقی کے ہاں مزاح کو جو چیز منفرد بناتی ہے وہ اس کا مقامی ماحول اور کئی زبانوں پر دسترس ہے۔ان کے ہاں جن علامات کا استعمال ہوا جو تشبیات اور استعارات استعمال کیے گئے ان کے مقامات اور کردار سبھی سے مقامیت کی بو آتی ہے۔ان کے اشعار میں مقامی پہاڑ جیسے مکڑا اور پیر چناسی، مقامی دریا جیسے نیلم اور جہلم، کشمیر کے مقامات جیسے بن جوسہ اور چکار وغیرہ یا بعض اداروں مثلاً اے جی آفس کو صابرؔ آفاقی نے اپنی شاعری میں استعارات کے طور پر استعمال کر کے دکھایا ہے۔صابرؔ آفاقی کے ہاں بعض علامتی کردار بھی ملتے ہیں جو ان کی اپنی تخلیق ہے۔یہ کردار سماجی رویوں کی مکمل نمائندگی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔مثال کے طور پر مولوی لقمان، سیٹھ مناشا وغیرہ۔صابرؔ آفاقی کے ایسے کردار ہیں جو معاشرے کے بعض گروہوں کے رویوں کے نمائندہ ہیں۔مقامی الفاظ کا استعمال بھی صابرؔ آفاقی کے مزاح میں جدید رنگ بکھیرتا ہے۔گوجری اور پہاڑی کے الفاظ کو برمحل استعمال کر کے وہ اپنی مزاحیہ شاعری میں مقامی رنگ اجاگر کرتے ہیں۔صابرؔ آفاقی کے ہاں مزاحیہ شاعری کے موضوعات تو زیادہ متنوع نہیں لیکن ان کی شاعری میں امتیاز ضرور ہے یہ امتیاز ان کے مضامین میں ملتا ہے۔صابرؔ آفاقی کی ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ ان کے ہاں زیادہ تر کلام غزل کی ہئیت میں ہی موجود ہے۔ان کی وہ نظمیں بھی جن کو انھوں نے عنوانات دیے ہیں اگر عنوانات نہ دیتے تو ان کی یہ نظمیں بھی نمکین غزلیات کے زمرے میں ہی آتیں۔ صابرؔ آفاقی کے ہاں انگریزی الفاظ کا استعمال بھی خوب ہے۔ ہمارے ہاں اکثر ایسے الفاظ جو مستعمل ہیں ان کو صابرؔ آفاقی نے بہت مہارت کے ساتھ برتا ہے۔مثلاً

ٹائپسٹ ایک جو تہہ خانے سے بھاگا اوپر
زرد تھا رنگ تو بھرائی ہوئی تھی آواز

(صابرؔ آفاقی، خندہ ہائے بے جا، ص۳۴)

یہ جو کالی ٹیبلٹ ہے اس کو ہر گھنٹے کے بعد
ہولے ہولے پان کی طرح چباتے جایئے

(صابرؔ آفاقی، خندہ ہائے بے جا، ص۵۱)

کرسی کے تلے شاید میگنٹ ہے لگا چھوڑا
جو شخص بھی بیٹھے ہے وہ اٹھ کے نہ جاوے ہے

(صابرؔ آفاقی، خندہ ہائے بے جا، ص۷۳)

درجہ بالا اشعار میں ٹاپسٹ، ٹیبلٹ، میگنٹ جیسے انگریزی الفاظ کو خوب صورتی سے استعمال کر کے معاشرتی مسائل پر طنز کیا گیا ہے۔ اسی طرح پہاڑی زبان کے الفاظ درج ذیل اشعار میں دیکھے جا سکتے ہیں:

اس قدر اسکول کھولے اہل حرفہ نے یہاں
ہر گلی کے اک مکان میں ہم نے ٹلیاں دیکھیاں

(صابرؔ آفاقی، خندہ ہائے بے جا، ص۳۱)

دیے بال کے دو بنیرے تے رکھاں
کہ ماہی دیاں دکھدیاں دونویں اکھاں

(صابرؔ آفاقی، خندہ ہائے بے جا، ص۴۲)

کل ایک بابو گاؤں کا کہتا تھا صابرؔ یہ مجھے
میں بھی ''کچھوں گا'' شہر میں آوں گا ٹی وی ''ہیر'' کر

(صابرؔ آفاقی، خندہ ہائے بے جا، ص۶۴)

وہ مطلب کو کہا کرتا تھا ''مطبل''
بصارت کو ''صبارت'' بولتا تھا

(صابرؔ آفاقی، خندہ پائے بے جا، ص۹۶)

کہاں تک میں بتاؤں تجھ کو صاؔبر
کہ وہ کیسی عبارت بولتا تھا

(صاؔبر آفاقی، خندہ ہائے بے جا،ص۹۶)

مذکورہ شعار میں ''ٹلیاں'' بہ معنی گھنٹیاں، دکھدیاں، '' کچھوں گا'' بہ معنی جاؤں گا اور ''ہیر'' بہ معنی دیکھنا جب کہ مقامی لہجے میں مطلب کو ''مطبل'' کہا جاتا ہے۔ یہ تمام الفاظ مقامی لہجے کی عکاس کرتے ہیں۔ان اشعار میں صاؔبر آفاقی ان لوگوں کی بھی بات کرتے ہیں جو خود کو پڑھا لکھا کہہ کر دوسروں پر رعب ڈالتے ہیں۔

سیاسی شعور:

کشمیری قوم اپنی تاریخ میں ہمیشہ بدترین سیاسی حالات کا شکار رہی ہے۔شروع کے چند سو سال کے علاوہ کشمیری ہمیشہ ہی اپنی بقا کی جنگ لڑتے رہے ہیں۔تاریخ شاہد ہے کہ اس خطے پر بیرونی سیاسی طاقتوں کے عمل دخل سے اس خطے کا حسن اور یہاں کے بیش قیمت وسائل کو جہاں گوناگوں مسائل کا سامنا رہا وہیں یہاں کے باشندے طرح طرح کے مسائل سے دوچار رہے۔۱۸۸۵ئمیں جب اکبر کے ہاتھوں علاقے کی خودمختاری سلب ہوئی تو پھر آج تک یہ اپنی آزادی کے لیے تگ ودو میں ہے۔

آزاد کشمیر کے شعرانے اپنی اس تاریخ کے تمام سفر کو بڑی گہری نظر سے دیکھا ہے اور اس سارے معاملے میں ان کی دل چسپی واضح ہے۔خطے کے سبھی شعرانے آزاد کشمیر کے سیاسی اور حکومتی اداروں کی کارگردگی اور ان کے رویوں کا بہ نظرِ غائر جائزہ ہے۔ریاستی سیاسی معاملات کے علاوہ پاکستان کے سیاسی حالات بھی شعرا کے سامنے رہے اور ان کی توجہ اس طرف بھی کم نہ رہی۔اس کی بنیادی وجہ اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے؟ کہ آزاد کشمیر کے سیاسی حالات کسی نہ کسی طرح پاکستان کی سیاست سے ضرور بہ ضرور تعلق رہا ہے۔دورِ حاضر میں یہ تعلق مزید مستحکم ہو چکا ہے۔آزاد کشمیر کے شعرانے تمام تر سیاسی منظر نامے کو بہت واضح اور جدید انداز میں اپنے اشعار کی صورت میں بیان کیا ہے۔اس پس منظر میں تخلیق ہونے والی شاعری میں جہاں لہجے کی بے ساختگی ہے وہیں خلوص کا جذبہ بھی کارفرما ہے۔صاؔبر آفاقی ریاست کے انھی شعرا میں سے ایک ہیں۔ جنھوں نے اپنے کلام میں سیاسی منظر نامے کو نہ صرف بیان کیا بل کہ اس میں اپیل اور تاثیر کا عنصر بھی ملتا ہے۔

صابرؔ آفاقی نے اپنی غزل میں اس فکر کو بڑے قرینے کا ساتھ جگہ دی ہے۔آزاد کشمیر میں اردو شاعری کو جتنا بھی فروغ حاصل ہوا اس میں روز بہ روز فکری سطح بھی بلند ہوتی چلی گئی۔ پاکستان میں ایوب خان کے مارشل لا کے بعد پاکستان کے سیاسی حالات میں ہل چل پیدا ہوئی ادھر ہی آزاد کشمیر میں بھی جمہوریت پسندوں نے اپنی سیاسی بے داری کا ثبوت دیتے ہوئے ایک نئی سوچ کو جنم دیا۔صابرؔ آفاقی نے ان تمام تر سیاسی حالات کو اپنی نظموں اور غزلیات میں برتا ہے۔ان کے کلام میں سے اس فکر کے اشعار دیکھیں:

ہر عہد کا ہوتا ہے نئی طرح کا چیلنج
ہر عہد کا ہوتا ہے سوال اور طرح کا

(صابرؔ آفاقی، سارے جہاں کا درد،ص۶)

لاکھ زمانہ اورلگاتے
کس نے فانی ہو جانا ہے

(صابرؔ آفاقی، سارے جہاں کا درد،ص۸)

صابرؔ آفاقی جانتے ہیں کہ اس زمانے میں جس نے بھی اس سچ کو بیان کرنے کی کوشش کی وہ مصلوبِ دار کر دیا گیا ہے۔ڈاکٹر ماجد محمود ماجدؔ کے مطابق:

''صابرؔ آفاقی چوں کہ ایک شاعر ہونے کے علاوہ ایک دردمند انسان بھی تھے۔اس لیے ان کے کلام میں ان کے خیالات کی واضح عکاسی ملتی ہے۔ وہ جب بھی اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں ان کو اس خیال نے بھی گھیرے ہوتا ہے کہ یہاں سچ کو وجہ سے زندگی اجیرن ہو سکتی ہے۔'' ۲۷

ڈاکٹر ماجدؔ محمود کی تائید میں صابرؔ آفاقی کا یہ شعر بھی دیکھیے۔

تم کیسے خیالات کا اظہار کرو ہو
اپنے لیے کیوں زیست کو دشوار کرو ہو

(صابرؔ آفاقی، سارے جہاں کا درد،ص۱۲)

میری آنکھوں نے دکھایا ہے مجھے عصر جدید
پردہ حائل ہی نہیں دیدۂ بیدار کے آگے

(صابرؔ آفاقی ،شہرِتمنا،ص۲۴)

آئے گا جوبن نیا پھر ارض پاکستان پر
خندہ زن پھر پھول ہوں گے، وحشتِ طوفان پر

(صابرؔ آفاقی ،شہرِتمنا،ص۱۲۴)

جب کہ زر دار کے ہاتھوں میں ہو روزی اس کی
ایسے ماحول میں مجبور کو جینا مشکل

(صابرؔ آفاقی ،شہرِتمنا،ص۱۶۰)

شاید یہی ہوں اہل سیاست کی عظمتیں
مشکل اگر ہو ایک انھیں سو دکھائی دے

(صابرؔ آفاقی ،شہرِتمنا،ص۶۲)

امن کی تلاش:

صابرؔ آفاقی ہرطرح کے فتنہ وفساد کی گھٹن سے الگ ہوکر جینا چاہتے ہیں۔ وہ اس بات کے حامی ہیں کہ ہماری دھرتی امن کا گہوارا بن جائے وہ ہرطرح کے ظلم وستم کو ناپسند کرتے ہیں جیسا کہ حکیم محمد سعید لکھتے ہیں۔

''صابرؔ آفاقی کو دلی تمنا ہے کہ دنیا جنگ کے عذاب سے محفوظ رہ کر امن اور آشتی کی طرف رواں دواں رہے۔مقصدیت کے اس شاعری کی سمت و جہت کر دیا ہے۔''۲۸

صابرؔ آفاقی چوں کہ وسیع المطالعہ ادیب تھے انھوں نے عالمی ادب سمیت تمام طرح کے ادب کا مطالعہ کر رکھا تھا۔ وہ اس بات سے بہ خوبی آشنا تھے کہ ادب کا جہاں کام حظ وتسکین کی فراہمی ہے وہیں ادب مقصدیت اور اصلاح معاشرہ کا کام بھی کرتا ہے۔ عالمی ادب وفن کی طرح صابرؔ آفاقی بھی امن و آزادی اور رواداری کے گیت گاتے ہیں۔ صابرؔ آفاقی

با قاعدہ تو ترقی پسند تحریک سے وابستہ نہیں تھے لیکن ان کے ہاں ترقی پسندی بہت نمایاں ہے۔۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کے نفاذ کے بعد ادب پر اس کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ ترقی پسندی کی بہت ہی گہری چھاپ اردو شعرا کے پاس دکھائی دیتی ہے۔کئی رومانوی ادیب وشاعر بھی لاشعوری طور پر اس تحریک کے زیرِ اثر آ گئے۔ترقی پسند مصنفین نے ایسے ادبی رجحانات کی داغ بیل ڈالی جس نے روئے زمین پر فرقہ پرستی، نسلی تعصب، مذہب اور جنس کے ساتھ ساتھ قومیت کی وجہ سے انسانیت کی تذلیل کو روکنے کی بات کی۔ جہاں بھی انسانیت کا قتل عام ہوا یا انسانی استحصال ہوا اس کو ختم کرنے میں ترقی پسندوں نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔اس فکر کی ضرورت کو یوں بھی زیادہ محسوس کیا گیا کہ ابلاغ کی ترقی نے دنیا کے تمام انسانوں کو ایک دوسرے کے بہت قریب کر دیا جس کی بنا پر لوگوں کے سیاسی وسماجی اور اقتصادی مفادات ایک دوسرے سے مشروط ہو گئے۔سردار جعفری کے مطابق:

''جب برما کے عوام بیدار ہوتے ہیں تو امریکا میں ربڑ اور تیل حرام ہو جاتی ہیں۔ جب تیل کا بھاؤ بدلتا ہے تو ہندوستان کے دور دراز دیہات میں غلہ مہنگا ہو جاتا ہے۔ دوسری عالمی جنگ چھڑتی ہے۔تو بمبئی میں چیزوں کے دام بڑھ جاتے ہیں اور بنگال میں چاول نایاب ہو جاتا ہے اور ۳۵ لاکھ انسان ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتے ہیں۔'' ۲۹

ان حالات میں دنیا بھر کے ادبا وشعرا کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہو جاتا ہے اور ان پر فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی زمین کو ایک اور عالمی جنگ سے محفوظ رکھنے کے لیے اپنے اپنے حصے کا کردار ادا کریں۔آزاد جموں وکشمیر کا یہ خطہ اگر چہ اپنی جغرافیائی ہیت کے اعتبار سے دنیا سے الگ ہے لیکن دنیاوی معاملات سے الگ رہنا ناممکن ہے۔آزاد کشمیر کے شعرا اس بات کا ادراک رکھتے ہیں کہ ان کا شعری سرمایہ ان کا قومی ورثہ ہونے کے علاوہ عالمی ادبی سرمائے میں بھی ان کا حصہ ہے۔ چناں چہ آزاد کشمیر کے شعرا کے ہاں یہ فکر بدرجہ اتم موجود ہے۔اس فکر کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ اس خطے میں امن کا مسئلہ دہائیوں پر محیط ہے۔کشمیری قوم تاریخ کی بدترین جارحیت سے برسرِ پیکار ہے۔ظلم و جبر کی چکی میں پسی اس قوم کے شعرا میں ظلم کے خلاف نفرت قدرتی امر ہے اور یہ چیز ان کی سرشت کا حصہ بن چکی ہے کہ جہاں ظلم دیکھا اس کے خلاف آواز بلند کرنا اپنا فرض عین سمجھ لیا۔اپنے مظالم سہتے سہتے اس قوم کے اندر اس قدر رنج بو پیدا ہو چکا ہے کہ دنیا میں کہیں بھی جبر ہو کوئی بھی قوم مظلوم ہو اس کے ساتھ اظہارِ ہمدردی کشمیری شعرا کے ہاں لازمی دکھائی دیتی ہے۔ڈاکٹر صابرؔ آفاقی نے دنیا کو کھلی

آنکھوں سے دیکھا تھا۔لوگوں کے دکھوں کو وہ دیکھ کر کڑھتے اور اس پر نوحہ خوانی کرتے تھے۔کبھی ایسا نہ ہوا کہ وہ کسی کے غم میں غم گین نہ ہوئے یا کسی کے اوپر ہونے والے ظلم کی مذمت نہ کی ہو۔صابرؔ آفاقی کی شاعری میں امن عالم کے گیت ملتے ہیں۔انھوں نے اپنی تخلیقی فکر میں امن عالم کے سفید علم کو بڑی مضبوطی سے تھاما ہوا ہے۔صابرؔ آفاقی نے عالمی سطح پر آزادی کی تحریکوں کی حمایت کی ہے۔قوموں کے حق خوداری کے لیے آواز اٹھانا اور نسل پرستی سے نفرت ان کے کلام کا خاصا ہے۔ امنِ عالم کے حق میں اور جنگ وجدل کے خلاف صابرؔ آفاقی نے جو آواز اٹھائی اور جہاد بالقلم کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔وہ کہتے ہیں۔

امن کے واسطے تدبیر کرو تو جانیں
خطۂ ارض کی تعمیر کرو تو جانیں

(صابرؔ آفاقی،شہر تمنا،ص۶۲)

چاند کی تیرہ خلاؤں میں بھٹکنے والو
دل کے افلاک کو تسخیر کرو تو جانیں

(صابرؔ آفاقی،شہر تمنا،ص۶۲)

صابرؔ آفاقی کی یہ آواز اس بات کا پتا دیتی ہے کہ وہ امن اور بھائی چارے کے کس قدر حامی ہیں۔عالمی اخوت ان کے لیے بہت اہم ہے۔صابرؔ آفاقی بہائی عقیدے کے پیروکار تھے لیکن ان کی فکری کاوشیں کسی قبیلے یا مذہب سے بالاتر ہیں۔ان کے عقیدے میں جنگ کے خلاف ردِعمل اور نفرت کا عنصر پایا جاتا ہے۔وہ اس بات کا پرچار کرتے ہیں کہ امن بہا کی تعلیم ہے۔صابرؔ آفاقی کے ہاں امن ومحبت کی یہ بازگشت بہت نمایاں ہے۔وہ انسانیت کے زوال پر بھی نظر رکھے ہوئے ہیں اور اس بات کے بھی دعوے دار ہیں کہ امنِ عالم کا علم انھوں نے سرنگوں نہیں ہونے دیا۔مثالیں دیکھیں:

زوالِ آدمِ خاکی کا اب یہ عالم ہے
فلک کی آنکھ میں آنسو دکھائی دیتے ہیں

(صابرؔ آفاقی،شہر تمنا،ص۶۱)

علم بلند ہے ہم سے ہی امنِ عالم کا
وہ خوش نصیب ہیں جو آ کے ہم سے ملتے ہیں

(صابرؔ آفاقی،شہرِتمنا،ص۲۲)

ہر ایک چیز میسر ہے آج انساں کو
مگر نہیں جو میسر تو اک سکوں ہی نہیں

(صابرؔ آفاقی،شہرِتمنا،ص۳۷)

ڈاکٹر صابرؔ آفاقی امن،سکون اور آشتی کے پیامبر کی حیثیت سے اپنے حصے کا کام کس خوش اُسلوبی سے کر رہے ہیں۔ ہیں مزید اشعار سے یہ بات بہ آسانی سمجھی جاسکتی ہے۔

اب وقت کے سالار کا یہ حکم ہے صابرؔ
جو امن کے حامی ہیں وہ لشکر میں رہیں گے

(صابرؔ آفاقی،شہرِتمنا،ص۴۴)

امن گوتم کا سندیسہ ، امن عیسٰیؑ کا پیام
جنگ نا سمجھوں کی باتیں ، جنگ نادانوں کا کام

(صابرؔ آفاقی،شہرِتمنا،ص۱۰۲)

تم نے پسماندہ ممالک کا اڑادیا ہے مذاق
اشک انصاف کی آنکھوں سے ٹپکتے ہیں ابھی

(صابرؔ آفاقی،شہرِتمنا،ص۱۱۳)

ڈاکٹر صابرؔ آفاقی کے کلام میں امن اور محبت کا درس اور جنگ وجدول سے نفرت کے حوالے سے حکیم محمد سعیدؔ یوں رقم طراز ہیں:

’’ان کی شاعری میں اساس کلیتہً محبت پر ہے،اس لیے اس میں امن سے محبت، وطن سے

محبت انسانیت سے محبت اور محبوب سے محبت کے بہت سے گوشے جگ مگ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔غالباً صابرؔ کے ساتھ آفاقی کا اضافہ ان کی محبت کے اس کردار کی نمائندگی کرتا ہے۔امن و محبت لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔جس دھرتی پر امن ہو گا وہاں محبت، خلوص، ہم دردی اور انسان دوستی کا بول بالا ہو گا اور جنگ کسی سرزمین پر بھی لڑی جائے وہ محبت خلوص، ہم دردی اور انسان دوستی کا نام و نشان مٹا دیتی ہے۔'' ۱۵

ڈاکٹر صابرؔ آفاقی کا مجموعہ ''سارے جہاں کا درد'' ان کی ایسی ہی شاعری پر مبنی ہے جس میں انھوں نے ہر انسان کے کرب اور تکلیف کو محسوس کیا ہے۔وہ اپنے اشعار میں انسانیت کی بات کرتے ہیں، محبت کی اور امن کی بات کرتے ہیں۔ صابرؔ آفاقی اس بات سے انکار کرتے ہیں کہ جنگ اور ظلم کسی بھی قوم کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔یہی جنگیں ہیں جن کی وجہ سے انسانیت مجروح ہوتی رہی، امن تباہ ہوتا رہا اور نفرت جنم لیتی رہی، وہ ہر اچھی قوم کی خوبی امن کو قرار دیتے ہیں:۔

تم اچھی قوم سمجھتے ہو اپنی قوم کو، پر
جو قوم اچھی تھی اس میں تو آشتی تھی بہت

(صابرؔ آفاقی، سارے جہاں کا درد، ص۷۹)

قیامِ امن ہمارا ہی مدعا تو نہیں
ارادے اس میں جفاو قدر کے دیکھتے ہیں

(صابرؔ آفاقی، سارے جہاں کا درد، ص۸۰)

مٹے کی جنگ شریروں کا خاتمہ ہو گا
اجالے اب کے افق پر سحر کے دیکھتے ہیں

(صابرؔ آفاقی، سارے جہاں کا درد، ص۸۲)

صدیوں نے تخلیق کیا ہے جو شہ پارہ جیوے
جس پر کوئی جنگ نہ ہو وہ سیارہ جیوے

(صابرؔ آفاقی، سارے جہاں کا درد، ص۸۹)

پاکستان کے ملا نے پکڑا بیوپار
دھرم کو چھوڑ کے پھر سے اٹھائے گٹار

(صابرؔ آفاقی، سارے جہاں کا درد، ص۱۶۱)

امن کا سورج ڈوب گیا چھائی گھٹا گھنگھور
میں اس غم میں چور ہوں، تم بھی کرنا غور

(صابرؔ آفاقی، سارے جہاں کا درد، ص۱۶۱)

عالمی پیچیدگیوں کے حوالے:

صابرؔ آفاقی کے ہاں دیگر شعرائے آزاد کشمیر کی طرح عالمی واقعات کے اثرات بھی بہ آسانی ملتے ہیں۔ آزاد کشمیر کے شاعروں نے عالم میں رونما ہونے والے واقعات سے کبھی بھی غفلت نہ برتی نہ ہی چشم پوشی کی۔ یہی اثر انگیزی تھی جس کے باعث نئے رویے اور نئے رجحانات کے ساتھ ساتھ عالمی تحریکیں وجود میں آئیں۔ دنیا میں کہیں بھی غیر معمولی واقعات ظہور پذیر ہوئے کشمیری شعرا نے ان کے اثرات بالکل ویسے ہی قبول کیا جس طرح عالمی ادبا و شعرا نے قبول کیا۔ صابرؔ آفاقی کا کلام اس بات کا بین ثبوت ہے کہ انھوں نے بین الاقوامی واقعات، موجود لمحات کے چیلنجز، اور عالمی ادبیات کے ساتھ ساتھ آفاقی فکری رویوں کو بھی قبول کیا۔ انقلابِ ایران ہو یا امریکا کے ۹/۱۱ واقعات ان تمام کے حوالے سے صابرؔ آفاقی نے اپنے حصے کا کام کیا اور ان کو بیان کیا۔ انھوں نے اپنی غزلیات، منظومات اور قطعات میں ان واقعات کو موضوعِ سخن بنایا۔ انقلاب کے حوالے سے وہ یوں لکھتے ہیں:

جیسے اگتی ہے مون سون میں گھاس
روز یوں انقلاب اگتے ہیں

(صابرؔ آفاقی، سارے جہاں کا درد، ص۵۳)

دورِ حاضر کے چیلنج کا وہ بھرپور ادراک رکھتے ہیں وہ اس بات سے قطعاً غافل نہیں کہ آئندہ وقت میں دنیا اب سے بڑھ کر مسائل سے دوچار ہو جائے گی۔ ان کی یہ سوچ اور یہ خیال ان الفاظ کی صورت میں ملتا ہے۔

اگلی صدی کے اور ہیں چیلنج اس کے تقاضے اور
اس کے لوگ اور، اس کے مسائل، اس کے ضابطے اور

(صابرؔ آفاقی، سارے جہاں کا درد، ص۵۹)

صابرؔ آفاقی کے ہاں اس طرح کے بے شمار اشعار ہیں جن کو دیکھ کر اس بات کا بھرپور احساس ہوتا ہے کہ وہ دیگر جدید فکری رویوں کے ساتھ ساتھ عالمی انسانی رویوں کے بارے میں خاصے سنجیدہ تھے۔ ان کے کلام میں اس طرح کے مضامین تسلسل کے ساتھ ساتھ موجود ہیں اور ان مضامین میں ایک قسم کی فکری یک جہتی اور ہم آہنگی کا احساس بھی کارفرما ہے۔ صابرؔ آفاقی کا کلام میں ایک اور خاص بات یہ کہ وہ عالمی ادب کے بڑے ناموں کو بھی چنداں نہیں بھولے اس بات کا ثبوت ان کی ایک پوری مرتب کردہ کتاب ''خاتونِ عجم'' ہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے ایران کی اس انقلاب پسند شاعرہ کو اپنے منظوم کلام اور غزلیات میں بھی جا بہ جا خراج تحسین پیش کیا ہے۔

تھی تو وہ عورت مگر اس کا لقب ''فخر رجال''
وہ نظر آتی ہے مردوں میں بھی لاثانی مجھے

(صابرؔ آفاقی، سارے جہاں کا درد، ص۱۰۰)

طاہرؔہ کی مشکلوں کو یاد کر لیتا ہوں
اس طرح جینے میں ہو جاتی ہے آسانی مجھے

(صابرؔ آفاقی، سارے جہاں کا درد، ص۱۰۱)

قرۃالعین طاہرہ کا دوسری جگہ یوں ذکر کرتے ہیں:

طاہرؔہ کے کام پر انگشتِ زیرلب ہوں میں
اسی کی اک اک بات رکھتی ہے سدا ششدر مجھے

(صابرؔ آفاقی، سارے جہاں کا درد، ص۱۰۱)

وطن عزیز کا بیان:

صابرؔ آفاقی کا تعلق ایک ایسی سرزمین سے ہے جو دریائے نیلم (کشن گنگا) کے کنارے موجود ہے۔ دریائے جہلم کے کنارے بسنے والوں کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ یہ لوگ بلا کے ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ محبِّ وطن بھی ہوتے ہیں۔ وطن کی محبت انسان کی سرشت ہے۔ انسان کی یہ فطرت ہے کہ اسے اس کی اپنی دھرتی عزیز تر ہوتی ہے۔ کسی بھی مذہب وملت سے تعلق رکھنے والے لوگ اپنی جنم بھومی اور اپنی سرزمین سے والہانہ عقیدت رکھتے ہیں۔ وہ اس بات پر بہت زیادہ یقین رکھتے تھے کہ کشمیر کی آزادی کا سورج جلد طلوع ہوگا۔ صابرؔ آفاقی اس بات کو بھی رد نہیں کر رہے کہ اس دھرتی کے باسیوں پر جو ظلم وستم روا رکھا گیا وہ بدترین ہے۔ صابرؔ آفاقی نے کشمیر کے رہنے والوں میں جذبۂ آزادی کی شمع کو روشن رکھنے کے لیے خوب صورت الفاظ کا سہارا لیا اور بے مثل اشعار تخلیق کیے۔ پروفیسر مسرت صبوحی کے مطابق:

> ''ڈاکٹر صابرؔ آفاقی نے بلاشبہ اہل کشمیر کے شعورِ آزادی کو زندہ و پائندہ رکھنے کے لیے شعر و سخن کی لازوال قندیلیں روشن کی ہیں اور نظریاتی محاذ پر آزادی کی اس جنگ کو جاری رکھا ہے۔ جو جغرافیائی محاذ اور سیاسی بساط پر ٹھنڈی ہو چکی ہے۔ ڈاکٹر صابرؔ آفاقی جب کشمیریوں کی مظلومیت کی تصویر کھینچتے ہیں تو جذباتی انداز اختیار کر لیتے ہیں۔'' ۳۱

صابرؔ آفاقی کشمیر سے پاگل پن کی حد تک محبت کرتے تھے۔ ان کی تمام تر شاعری میں اکثر جگہوں پر وطن سے محبت کی جھلک نظر آتی ہے۔ ان کی بیشتر شاعری میں بنیادی موضوع کشمیر ہی ہے۔ جیسا کہ جمیل ملک لکھتے ہیں:

> ''صابرؔ آفاقی کا تعلق چوں کہ سرزمین کشمیر سے ہے اس لیے ان کی نظموں اور غزلوں میں اکثر و بیشتر کشمیر ہی کا ذکر ملتا ہے۔ علامہ اقبالؔ سے خاص عقیدت رکھتے ہیں۔ جب کہ وہ اپنے ہاں کشمیر سے متعلق علامہ اقبالؔ کے فکر و نظر، وابستگی کو کامیابی اور خوش اُسلوبی سے پیش کرتے ہیں۔'' ۱۷

صابرؔ آفاقی کسی بھی مقام پر کشمیر اور اس کے باشندوں کو بھولے نہیں۔ وہ اپنے پیدائشی ضلع مظفرآباد کو بھی اپنے خون کی روانی کی طرح اور دل کی دھڑکن کے طرح اپنے ساتھ محسوس کرتے تھے۔ صابرؔ آفاقی کی ان تمام باتوں کا ثبوت ان کی وہ کتب ہیں جو انھی موضوعات کی حامل ہیں۔ ان کتب میں ''اقبالؔ اور کشمیر'' اور صابرؔ آفاقی کی زندگی کی شائع ہونے والے آخری کتاب ''مظفرآباد'' ہیں۔ یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ مذکورہ بالا کتب صابرؔ آفاقی کی تنقیدی اور

تاریخی اعتبار سے عمدہ کتابیں ہیں۔صابرؔ آفاقی کے شعری مجموعوں میں اس موضوع اور فکر کے اشعار ملاحظہ ہوں:

دیتی ہیں جھونک جنگ کی بھٹی میں اپنے لال
اللہ! یہ بھی حوصلے ہوتے ہیں ماؤں کے!

(صابرؔ آفاقی،شہر تمنا،ص۲۹)

گوشت کی سب دکانیں بند سی ہیں
جب سے سستا ہمارا ماس ہوا

(صابرؔ آفاقی،شہر تمنا،ص۳۶)

اس نگری میں لٹنے والا میں پہلا انسان نہیں
اس نگری کے رہنے والے روز یہی بیوپار کریں

(صابرؔ آفاقی،شہر تمنا،ص۵۳)

جنگ کے شعلے بدستور لپکتے ہیں ابھی
پنجۂ جور میں انسان سسکتے ہیں ابھی

(صابرؔ آفاقی،شہر تمنا،ص۱۱۳)

اے خاکِ پاک! تیرے تقدس کی ہے قسم
ذروں کو رشکِ مہر درخشاں کریں گے ہم

(صابرؔ آفاقی،شہر تمنا،ص۱۱۹)

میری آنکھوں میں بسا ہے وہی خونیں منظر
یاد ہے مجھ کو ابھی مقتل شہر جموں

(صابرؔ آفاقی،شہر تمنا،ص۱۳۸)

اپنے شہر مظفرآباد کے بارے میں صابرؔ آفاقی اپنے جذبات کو کچھ ان الفاظ کا روپ دیتے ہیں:

یہ شہر پہاڑوں میں نگینے کی طرح ہے
یہ کوہ کی موجوں میں سفینے کی طرح ہے

(صابرؔ آفاقی، شہر تمنا، ص ۱۴۱)

مسکن ہے مرا آج جو نیلم کے کنارے
نزدیک سے کرتا ہوں مناظر کے نظارے

(صابرؔ آفاقی، شہر تمنا، ص ۱۴۵)

صابرؔ آفاقی دریائے نیلم کے کنارے رہائش پذیر رہے۔ شہر مظفر آباد کے بیچوں بیچ بہنے والا یہ دریا کشن گنگا کے نام سے جانا جاتا تھا لیکن تقسیم کے بعد اسے نیلم گاؤں کی نسبت سے نیلم کا نام دے دیا گیا۔ مظفر آباد کا شہر چاروں اطراف سے پہاڑوں میں گرا ہوا ہے۔

مقامات کے حوالے:

صابرؔ آفاقی کا شمار آزاد کشمیر کے ان شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے یہاں کی غزل میں ایک نئے لہجے کی بنیاد رکھی۔ صابرؔ آفاقی کی شاعری میں عہدِ رفتہ کی وارداتوں کے ساتھ ساتھ عصرِ حاضر کی حقیقتیں بھی ملتی ہیں۔ ان کی غزل کے فکری زاویے مختلف طرح کے ہیں۔ صابرؔ آفاقی نے ہر طرح کے مضامین کو اپنی غزل کا حصہ بنایا ہے۔ ان کی غزل جدید حیثیت کے بدلے ہوئے لہجے کی ترجمان ہے۔ صابرؔ آفاقی کے ہاں بے ساختگیٔ بیان موجود ہے۔ وہ جس سرزمین کے باسی تھے اس سرزمین کی ہر ہر شے ان کو عزیز تھی۔ صابرؔ آفاقی نے اپنے اشعار میں اس سرزمین کی مختلف جگہوں اور مقامات کا بیان اس قدر نفاست سے کیا ہے کہ قاری کے لیے وہ دل کشی کا باعث بن جاتا ہے۔ صابرؔ آفاقی نے جس بھی موضوع کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا اس میں ایسی جان ڈالی کہ وہ اسی کے ماہر لگے۔ صابرؔ آفاقی کی شاعری پر آصف ثاقبؔ لکھتے ہیں۔

''غزل میں فکر مند حیرانیاں سمیٹنا، نظم میں دور س خوش گمانیاں چننا اور ماہیے میں مدھ بھری من مانیاں کرنا صابرؔ آفاقی کے لیے سدا بہار شاعر ہی کا حصہ ہے۔ صابرؔ آفاقی نے یوں تو تحقیق و تنقید میں بھی جوہر دکھایا ہے مگر شاعری میں اس نے ایسا جادو بھرا ہے کہ سننے والا

کان اور دیکھنے والی آنکھ ہی جانے ہے۔کوئی بھی موضوع ہو اس کا قلم کہیں بھی نہیں
چوکتا۔''۱۸

آصف ثاقبؔ نے صابرؔ آفاقی کے بارے میں یہ بات بے بنیاد نہیں کہی۔ بلاشبہ صابرؔ آفاقی نے ہر طرح کی فکر کو اپنی غزل میں خوب صورتی کے ساتھ سمو دیا ہے۔ وہ نیلم و جہلم، چکار اور اپنے دیگر مقامات کا ذکر کس درجہ خوشی سے کرتے ہیں ملاحظہ ہو:

حسن کو آرائشوں کی کوئی حاجت ہی نہیں
حسن ہے نیلم، سماہنی، حسن ہے سہنسہ، کھڑک

(صابرؔ آفاقی، خندہ ہائے بے جا، ص۴۲)

یہاں صابرؔ آفاقی نے اپنے علاقوں کو کس قدر خوب صورتی سے بیان کیا اور ان کے حسن کو بھی اجاگر کیا۔ نیلم نہ صرف کشمیر بل کہ دنیا کی ایک حسین وادی ہے۔ ۱۹۶ کلومیٹر طویل یہ وادی مظفر آباد سے تاؤبٹ تک پھیلی ہوئی ہے جو تاریخی اعتبار سے بہت اہمیت کی حامل ہے کہ یہاں قبل از مسیح میں علم و ادب کا ایک بڑا مرکز شاردہ یونی ورسٹی موجود تھی۔ سماہنی ضلع بھمبر کا ایک خوب صورت علاقہ ہے جو مقبوضہ کشمیر کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ ضلع کوٹلی کا ایک خوب صورت علاقہ سہنسہ بھی ہے جس کو صابرؔ آفاقی نے حسن کہا ہے جب کہ ضلع راولاکوٹ کا مشہور گاؤں کھڑک جو ایک پہاڑ کی چوٹی پر ہے۔ اس گاؤں سے آزاد کشمیر کے پہلے صدر سردار ابراہیم خان کا تعلق ہونے کے باعث یہ گاؤں خوب صورت ہونے کے ساتھ ساتھ تاریخی اہمیت بھی اختیار کر چکا ہے۔ کھڑک میں ہی آزاد کشمیر کے اولین صدر سردار ابراہیم کا مقبرہ بھی موجود ہے جب کہ ان کا آبائی گھر بھی اسی جگہ اپنی اصل حالت میں آج بھی موجود ہے۔ ایسے ہی صابرؔ آفاقی کے ہاں مزید اشعار دیکھیئے:

نیلم کا جو دریا ہے مئے ناب یہی ہے
ڈھونڈا تھا جسے خضر نے وہ آب یہی ہے

(صابرؔ آفاقی، شہرِ تمنا، ص۱۴۴)

یہ طور مرا، پیر مرا، پیر چناسی!!
ہونے نہیں دیتا یہ ہوا شہر کی باسی

(صابرؔ آفاقی،شہرِتمنا،ص۱۴۱)

پیر چناسی مظفرآباد میں قریباً ۸۰۰۰فٹ بلند ایک صحت افزا سیاحتی مقام ہے۔ جہاں شہنشاہ کوہسار پیر نذیر حسین بخاری کا مزار مرجع خلائق عام ہے۔

سلتی ہیں یہاں پھول کی صد رنگ قبائیں
ملتی ہیں گلے نیلم و جہلم کی گھٹائیں

(صابرؔ آفاقی،شہرِتمنا،ص۱۴۱)

اس اور ہے دومیل تو اس اور ہے چھلہ
اس بیچ میں دریائے مئے ناب ہے پھیلا

(صابرؔ آفاقی،شہرِتمنا،ص۱۴۴)

دومیل مظفرآباد میں واقع وہ جگہ جہاں دریائے نیلم (کشن گنگا) اور دریائے جہلم (وتستا) باہم بغل گیر ہوتے ہیں۔

چھلہ مظفرآباد کا ایک ایسا علاقہ جہاں پر دریائے نیلم پر پل بنایا گیا ہے جس کے ساتھ ہی تاریخی قلعہ مظفرآباد موجود ہے۔

کس کی خاطر جاؤں میں گوہاڑی کے گاؤں
اب تو مجھ سے روٹھ گئی ماں کی ٹھنڈی چھاؤں

(صابرؔ آفاقی،سارے جہاں کا درد،ص۱۵۳)

اس شعر میں صابرؔ آفاقی نے اپنے گاؤں گوہاڑی کی بات کی ہے جو مظفرآباد کا مضافاتی گاؤں ہے۔مندرجہ ذیل شعر میں کوہِ مکڑا اور نیلم کا حوالہ دیکھیں:

مکڑا کی طرح بیٹھ نہ رہنا ایسے تنہا
ہمسایہ نیلم ہے تو بہنا اسے کہنا

(صابرؔ آفاقی،سارے جہاں کا درد،ص۵۱)

اُسلوبیاتی جائزہ:

صابرؔ آفاقی کے ہاں فن وفکر کے ساتھ ساتھ اُسلوب بھی نمایاں ہے۔اُسلوب کی بحث آسان کام نہیں ہے۔کسی

بھی اُسلوب کا معاملہ بہت رقت آمیز اور محنت طلب ہونے کے ساتھ ساتھ متنازعہ بھی ہوتا ہے۔ اتنا وقت گزرنے کے باوجود بھی اُسلوب کے معنی اور حدود کا حتمی تعین نہیں ہو سکا۔ اس حوالے سے پروفیسر مرے لکھتے ہیں کہ:

''آج تک اُسلوب کی جو تعریفات کی گئیں وہ گمراہ کن نہیں تو ناقص ضرور ہیں۔'' ۳۴

ہمارے ہاں اُسلوب سے مراد لکھنے والے کی انفرادی طرزِ نگارش ہے یا انگریزی میں اس کے لیے "Style" کا لفظ ہے۔ ناقدین کے مطابق کسی بھی شاعر یا ادیب کا اسلوب بننے میں اس کے معاشی، معاشرتی اور اقتصادی حالات کارفرما ہوتے ہیں۔ حقیقت یہی ہے کہ اسلوب فکری و معانی صورت و ہیت اور پیکر کے امتزاج کا نام ہے۔ آزاد کشمیر میں اردو شاعری کی روایت بہت قدیم نہیں جس وجہ سے یہاں کے شعرا کی اکثریت کے ہاں اسالیب کی بحث ابھی نامکمل ہے۔ تاہم یہ بات حقیقت کے قریب ہے کہ اکثر شعرا نے اپنے انفرادیت اور معاشرتی و معاشی مسائل کے پیشِ نظر جو اسلوب نکالا وہ خصوصیت کا حامل ہے۔

صابرؔ آفاقی آزاد کشمیر کے اہم غزل گو ہیں۔ انھوں نے اپنی غزل کے داخلی و خارجی ہر دو پہلوؤں پر یکساں توجہ دی ہے۔ وہ شعر کے جسم اور روح کو ایک ساتھ سامنے لانے اور اس میں چمک لانے پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کی غزل کلاسیکل روایت کے گہرے مطالعے کی خبر دیتی ہے۔ صابرؔ آفاقی کی غزل میں تصویریت کا عنصر زیادہ ہے اور اشعار میں متحرک تمثال کا قرینہ کارفرما ہے۔ صابرؔ آفاقی چوں کہ ایک استاد تھے ان کو زبان و بیان پر پوری دسترس حاصل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ زبان و بیان کے معاملے میں بہت محتاط واقع ہوئے ہیں۔ ان کے اس پہلو نے ان کی غزل میں خارجی ہیت کو مزید چار چاند لگا دیے ہیں۔ صابرؔ آفاقی چوں کے فارسی زبان پر پوری دسترس رکھتے تھے جس بنا پر پرانے کے فارسیت بھی ان کے اُسلوب کی خاص پہچان بن گئی ہے۔

صابرؔ آفاقی کی شاعری داخلی ور خارجی ہیت کا حسن و توازن زبان و بیان پر ان کی گرفت اور مزہ کا خوب صورت استعمال، چست بندشیں، بے مثل تراکیب اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ غزل میں ان کا اسلوب منفرد اور جداگانہ ہے۔ صابرؔ آفاقی کی تراکیب سازی درج ذیل اشعار میں ملاحظہ کریں۔

میرا یہ اعتدال طبیعت عجیب ہے
گھٹنے لگے جو سانس تو، برسے نئی غزل

(صابرؔ آفاقی، سارے جہاں کا درد، ص ۵)

میں وہ فقیر مستِ انا ہو کہ آج تک
مرزاں دل ہلاکو وچنگیز مجھ سے ہے!

(صابرؔ آفاقی، سارے جہاں کا درد، ص ۷)

آؤ صابرؔ کریں سیر گلستان عدم
زندگی کی ریت پر بیٹھے ہوئے عرصہ ہوا

(صابرؔ آفاقی، سارے جہاں کا درد، ص ۳۷)

صابرؔ آفاقی کے نمایاں اسلوب کے حوالے سے بلراج کومل رقم طراز ہیں!

''میں اردو شاعری کے اسالیب کے تعلق سے کسی ایسے کامیاب اُسلوب کو تصور نہیں کر سکتا جو مکمل طور پر فارسی نثر والفاظ اور تراکیب اور اضافت سے آزاد ہو لیکن اس بات کا متمنی ضرور ہوں کہ اردو زبان زیادہ سے زیادہ زمینی سادہ و باترسیل ہو جائے اور اپنے دائرہ الفاظ کو ترقی افزوں انداز میں وسیع اور وسیع تر کرتی جائے اور ایسی تخلیقی سطح اظہار دریافت کر لے جو نہ تو غیر ہموار ہو اور نہ ہی تاثر سے خالی، صابرؔ آفاقی میری دانست میں ایسی ہی سادہ و باترسیل اور بااثر زبان میں تخلیقی اظہار کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں۔'' ۳۵

صابرؔ آفاقی کی تراکیب کے علاوہ ان کے ہاں غالب فارسی الفاظ بھی ان کے خاص اسلوب کا پتا دیتے ہیں۔ صابرؔ آفاقی نے اپنی تمام شاعری میں غیر شعوری طور پر ایسے الفاظ کو برتا ہے۔ ان کا یہ وصف بھی ان کے نمایاں اسلوب نگارش کی علامت ہے۔ صابرؔ آفاقی نے میرؔ کی سادگی اور غالبؔ کی معنی آفرینی کو بھی کم نہیں ہونے دیا۔ یہ چیز بھی ان کے اُسلوب میں ان کو دیگر شعرا سے ممتاز کرتی ہے۔ احسانؔ دانش اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''ان کے ہاں میرؔ کی سادگی اور غالبؔ کی معنی آفرینی اس طرح گندھی ہوئے ہے کہ ان کا اسلوب سخن دوسرے شاعروں سے جدا ساحریت کا حامل ہو گیا۔۔۔ صابرؔ آفاقی صاحب لاہور سے دور مظفر آباد میں ہیں لیکن ان کو اسلوبِ نگارش اور پیرائیہ بیان عصرِ حاضر کے

ادبی کارواں سے قدم ملائے چل رہا ہے اور یہ سب یوں ہے کہ ان کا دین صاگ ہے اور عقائد میں کسی مسائل حیات اور وسائل معاشرہ پر ہوتا ہے۔'' ۲۱

صابرؔ آفاقی نے فارسی الفاظ وتراکیب کا برجستہ استعمال کیسے کیا ہے؟ ملاحظہ ہو:

گوہر ہے زیرِ دامنِ دریا چھپا ہوا
یارو! خزف کی گرمیِ بزار دیکھ کر

(صابرؔ آفاقی، شہرِ تمنا، ص۶۰)

اس دور میں ہیں زار کی عظمت کے نگہباں
ہم شعلہ بجاں، سربکف و خندہ جبیں لوگ

(صابرؔ آفاقی، شہرِ تمنا، ص۶۶)

پژمردہ غنچہ پائے چمن کو نوید ہو!
بادِ نسیم وابر کا ساماں کریں گے ہم

(صابرؔ آفاقی، شہرِ تمنا، ص۱۱۹)

گوہر تاباں بہت ہیں میرے بحرِ چشم میں
اب نہیں تیری صورت ، بریلسانی مجھے

(صابرؔ آفاقی، سارے جہاں کا درد، ص۱۰۲)

گر بہ مسکیں کو آ سکتی نہیں پنجہ زنی
وہ جو ہے ماتحت وہ تو فوق ہو سکتا ہے

(صابرؔ آفاقی، خندہ ہائے بے جا، ص۱۲۸)

اردو شاعری میں زمین کا استعمال کرنا بھی خاص ہنر سمجھا جاتا ہے۔ اکثر شعرا کے خاص اسلوب کا یہ چیز حصہ بن جاتی ہے۔ عموماً ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس شاعر کی زمین ہوتی ہے اس کا کلام اتنا مقبول نہیں ہو پاتا مگر بعد کے شاعر کا کلام مقبولیت حاصل کر لیتا ہے۔ میرؔ، غالب، سوداؔ، ذوقؔ، اقبالؔ ہر بڑے شاعر نے دیگر شعرا کی زمینوں کا استعمال کیا ہے۔ صابرؔ

آفاقی نے بھی فرازؔ، غالبؔ، اقبالؔ وغیرہ کی زمینوں سے استفادہ کیا ہے۔انھوں نے کئی اشعار پر تضمین اور گرہ لگا کر بھی اپنے اسلوب میں ایک خوش نما اضافہ کیا ہے۔صابرؔ آفاقی کے ہاں ایسی کئی غزلیات وقطعات موجود ہیں جوانھوں نے فرازؔ، سوداؔاور غالبؔ وغیرہ کی زمینوں میں کہے ہیں۔فرازؔ کی شہرہ آفاق غزل ''سنا ہے لوگ اس آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں'' کی زمین کو صابرؔ آفاقی نے جب استعمال میں لایا تو اس کا رنگ ملاحظہ ہو:

میں سوچتا ہوں تو سکتے میں ڈوب جاتا ہوں
سنا ہے لوگ بھی اک آہ بھر کے دیکھتے ہیں

(صابرؔ آفاقی،سارے جہاں کا درد،ص۸۲)

اب آؤ وقت کے دھارے کو ہم بدل ڈالیں
بگڑ کے دیکھ لیا ہے ، سنور کے دیکھتے ہیں

(صابرؔ آفاقی،سارے جہاں کا درد،ص۸۲)

سنا ہے قیمت امن وامان ہے جان عزیز
یہ بات سچ ہے تو جاں سے گزر کے دیکھتے ہیں

(صابرؔ آفاقی،سارے جہاں کا درد،ص۸۲)

فراز ترے تتبع میں قصیدہ کہا
اب اس کے بعد نتیجے اتر کے دیکھتے ہیں

(صابرؔ آفاقی،سارے جہاں کا درد،ص۸۲)

وہی ہیں گلشن فردا کے نغمہ خواں صابرؔ
جو خواب آج بہا کے نگر کے دیکھتے ہیں

(صابرؔ آفاقی،سارے جہاں کا درد،ص۸۲)

درج بالا غزل احمد فرازؔ کی غزل کی ہی طرح لکھی گئی غزل مسلسل ہے۔اس غزل کے آخر میں صابرؔ آفاقی نے اعتراف بھی کیا کہ یہ فرازؔ کی زمین ہے۔اسی طرح صابرؔ آفاقی نے دیگر شاعروں کی زمین میں جو طبع آزمائی کی وہ بھی

دیکھیں۔ میرؔ کی زمین میں غزل کے اشعار دیکھیں:

دھڑکا لگاہوا ہے سوپنوں یہ باغ کس کو
جاؤں جہان سے دے کر سینے کے داغ کس کو

(صابرؔ آفاقی، سارے جہاں کا درد، ص۶۳)

آنکھیں بجھیں تو یکساں تب ہو کر اور کوئی
دیکھو گے کر کے روشن اب تم چراغ کس کو

(صابرؔ آفاقی، سارے جہاں کا درد، ص۶۳)

دل میں جلا لیا ہے ہم نے چراغ حسرت
''اچھا لگے ہے اپنا گھر بے چراغ کس کو''

(صابرؔ آفاقی، سارے جہاں کا درد، ص۶۳)

غالبؔ کی زمین میں ایک مزاحیہ غزل دیکھیے:

فقیروں کا گھر گھر قدم دیکھتے ہیں
اثر کیا دکھائے گا ''دم'' دیکھتے ہیں

(صابرؔ آفاقی، خندہ ہائے بے جا، ص۱۳۱)

جو پنجاب کی سیر کرتے ہیں صابرؔ
ہر اک صحن میں وہ چلم دیکھتے ہیں

(صابرؔ آفاقی، خندہ ہائے بے جا، ص۱۳۱)

مرزا سوداؔ کی زمین میں ایک مزاحیہ غزل بھی صابرؔ آفاقی کے اسلوب کا حصہ ہے:

اس قدر اسکول کھولے اہلِ حرفہ نے یہاں
ہر گلی کے اک مکان میں ہم نے ٹلیاں دیکھیاں

(صابرؔ آفاقی، خندہ ہائے بے جا، ص۳۲)

بھائی پھیرو کے لگائے بھائی نے پھیرے بہت
ہم نے تو بس ایک دفعہ چیچو کی ملیاں دیکھیاں

(صابرؔ آفاقی، خندہ ہائے بے جا،ص۳۲)

صابرؔ آفاقی کے ہاں سادگی وسلاست اور روانی موجود ہے۔ان کے سادہ اور دل نشین انداز بیان نے ان کے اسلوب کوشیریں اوردل آویز بناڈالا ہے۔سنجیدگی اورمتانت کےعلاوہ ظرافت کےفطری ذوق کوبھی نظرانداز نہیں کرتے ان کی سنجیدہ شاعری میں بھی ظرافت درآتی ہے۔صابرؔ آفاقی کےاسلوب کی ایک اور خاص بات یہ بھی ہے کہ ہر بات کوصاف اورواضح الفاظ میں کہہ جاتے ہیں۔یقیناًان کےاس اسلوب میں وہ عوامل ضرورکارفرماہیں جن سےان کی زندگی عبارت ہے صابرؔ آفاقی کےاسلوب کی ایک اور بات وہ بہ آسانی سےان کے خاص اندازکوسامنےلاتی ہےمبالغہ آرائی سےاجتناب ہے ۔صابرؔ آفاقی کے ہاں مبالغہ آرائی نہ ہونے کی حدتک ہے۔ان کےشعرمعنویت اورمقصدیت سےبھرپور ہیں۔وہ اس بات کابہ خوبی ادراک رکھتے ہیں کہ شاعری میں تخیل،معنویت اوردیگرلازمی اجزا کےساتھ ساتھ مقصدیت بھی موجود ہوتو شعر کا لطف دوبالا ہوجاتا ہے۔احسانؔ دانش کاالفاظ میں!

> ’’ان کا ہرشعرمعنویت سے بھرپوراورمقصدیت سے مالا مال ہوتا ہے۔ایمائیت اور اشاریت سےبھی کام لیتے ہیں۔لیکن ان کےابہام میں دبازت نہیں ہوتی بل کہ نہایت لطافت اور چابک دستی سے اپنا مافی الضمیر قاری تک پہنچاتے ہیں۔اس میں کہیں کہیں اجمال کوتفصیل اورتفصیل کوتلخیص کا رنگ دیناپڑتا ہے جوان کے لیے معمولی بات ہے۔ ابہام اگربطن شاعرتک محدود رہےاور ابلاغ کی شرائط پر پورانہ اترےتو وہ دانش وروں کے حلقے میں قیمت نہیں پاتالیکن جوابہام روح کی جھلکاردےکرسامعین یا قارئین کو چونکادےوہ وہیں اس کاحسن بن جاتا ہے۔‘‘۳۷

صابرؔ آفاقی کےاسلوب میں یہ بات بھی خاص اہمیت کی حامل ہے کہ انھوں نےسنسکرت الفاظ کا بھی خوب صورت استعمال کیا ہے۔سنسکرت یاہندی الفاظ کااستعمال بھی شاعرکےکلام میں حسن وآہنگ پیدا کرتا ہےاور یہ الفاظ جب مہارت

سے استعمال کر دیں تو موسیقیت اور لے بھی پیدا کرتے ہیں۔صابؔر آفاقی کے لیے چوں کہ زبان مسئلہ نہیں تھی اس لیے انھوں نے جو بھی زبان استعمال کی اس کو اوج بخش دیا:

کیا کہیے یہ روگ ہے کیسا
اشک رواں ہیں چھم، چھم، چھم، چھم

(صابؔر آفاقی، شہرِ تمنا، ص۴۳)

اب تو سنوارو اہلِ تدبر!
کا کل گیتی برہم برہم

(صابؔر آفاقی، شہرِ تمنا، ص۴۳)

تیری سندرتا کیا ہوئی، کیسا لاکا روگ
مجھے کیا معلوم ہے، کچھ کہتے ہیں لوگ

(صابؔر آفاقی، سارے جہاں کا درد، ص۱۵۸)

نام جپوں بھگوان کا جو ہر کام بنائے
جب میں ڈوبے لگتا ہوں نیا پار لگائے

(صابؔر آفاقی، سارے جہاں کا درد، ص۱۶۱)

درج بالا اشعار کے علاوہ بھی صابؔر آفاقی کی شاعری میں اس طرح کے بے شمار اشعار موجود ہیں جن میں وہ ایک خاص اسلوب میں نظر آتے ہیں۔صابؔر آفاقی کے قد کے اعتراف میں ایم یامیؔن لکھتے ہیں:

''صابؔر کسی شخص کا نہیں بل کہ ایک عہد کا، ایک باب کا اور ایک تاریخ کا نام ہے جس کو کبھی فنا نہیں آ سکتی۔''۳۸

حوالہ جات

۱۔ منظور ہاشمی (دیباچہ)،ساز دل صدا، نیلم پبلی کیشنز، مظفر آباد،۲۰۱۴ء، ص۸۔

۲۔ مقالہ نگار کا شوکت اقبال سے انٹرویو، بتاریخ ۱۷، جون ۲۰۱۷ء، بمقام مظفر آباد۔

۳۔ ایضاً۔

۴۔ ایضاً۔

۵۔ احمد ندیم قاسمی (فلیپ)،ثنا، الطاف قریشی، نقیب پبلی کیشنز، مظفر آباد،۱۹۸۳ء۔

۶۔ مقالہ نگار کا سیدہ آمنہ بہار سے انٹرویو، بتاریخ ۲۳، اپریل، ۲۰۱۷ء، بمقام مظفر آباد۔

۷۔ ایضاً۔

۸۔ ایضاً۔

۹۔ مقالہ نگار کا زاہد کلیم سے انٹرویو، بتاریخ ۲۸، دسمبر، ۲۰۱۶ء، بمقام مظفر آباد۔

۱۰۔ ایضاً۔

۱۱۔ یوسف حسین خان، ڈاکٹر، اردو غزل، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ،۲۰۱۰ء بار پنجم، ص۱۷۲۔

۱۲۔ حالی، الطاف حسین، مقدمہ شعر و شاعری، مشتاق بک کارنر، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص۷۷۔

۱۳۔ غلام سرور، کرنل (دیباچہ)، محرابِ فکر، زاہد کلیم، نیلم پبلی کیشنز، مظفر آباد، ۲۰۰۶ء، ص۲۰۔

۱۴۔ مخلص وجدانی (دیباچہ)، نغمۂ تارِ حیات، زاہد کلیم، انٹرنیشنل پریس، کراچی، ۱۹۸۰ء، ص۹۔

۱۵۔ صدیقی، ابوالاعجاز حفیظ، تنقیدی اصلاحات، اسلوب، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء، ص۳۰۸۔

۱۶۔ انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء، ص۹۱۔

۱۷۔ یوسفی، مشتاق احمد، چراغ تلے، مکتبہ دانیال، کراچی، ۱۹۶۶ء، ص۳۱۔

۱۸۔ صابر آفاقی، ڈاکٹر، (دیباچہ)، نغمۂ تارِ حیات، زاہد کلیم، انٹرنیشنل پریس، کراچی، ۱۹۸۰ء، ص۷۔

۱۹۔ مسرت صبوحی، پروفیسر، کشمیر میں مزاحمتی ادب، علی پرنٹرز، میر پور، ۲۰۱۴ء، ص۱۰۱۔

۲۰۔ انور مسعود، پروفیسر، (پیش لفظ)، خندہ ہائے بے جا، صابر آفاقی، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۴ء ص۸۔

۲۱۔ مقالہ نگار کا ڈاکٹر گوہر نوشاہی سے انٹرویو، بتاریخ ۲۸، دسمبر، ۲۰۵، بمقام بارہ کہو، اسلام آباد۔

۲۲۔ سید ضمیر جعفری، (پیش لفظ)، شہر تمنا، صابر آفاقی، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۴ء ص ۹۔

۲۳۔ احسان دانش، (دیباچہ)، شہر تمنا، صابر آفاقی، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۴ء ص ۷۔

۲۴۔ مسرت صبوحی، پروفیسر، کشمیر میں مزاحمتی ادب، علی پرنٹرز، میرپور، ۲۰۱۴ء، ص ۱۵۔

۲۵۔ انور مسعود، پروفیسر، (پیش لفظ)، خندہ ہائے بے جا، صابر آفاقی، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۴ء ص ۸۔

۲۶۔ ایضاً۔

۲۷۔ مقالہ نگار کا ڈاکٹر ماجد محمود ماجد سے انٹرویو، بتاریخ ۱۳ ستمبر، ۲۰۱۵ء، بمقام راولاکوٹ۔

۲۸۔ محمد سعید حکیم (دیباچہ)، سارے جہاں کا درد، صابر آفاقی، ص ۱۔

۲۹۔ سردار جعفری، ترقی پسند ادب، مکتبہ پاکستان، لاہور، ۱۹۵۶ء، ص ۱۶۔

۳۰۔ محمد سعید حکیم (دیباچہ)، سارے جہاں کا درد، صابر آفاقی، ص ۱۔

۳۱۔ مسرت صبوحی، پروفیسر، کشمیر میں مزاحمتی ادب، علی پرنٹرز، میرپور، ۲۰۱۴ء، ص ۱۰۴۔

۳۲۔ جمیل ملک، نوائے وقت (روزنامہ)، راولپنڈی، ۳، جولائی، ۱۹۸۰۔

۳۳۔ آصف ثاقب (مقدمہ)، سارے جہاں کا درد، صابر آفاقی، ص ۱۴۳۔

۳۴۔ عابد علی عابد، سید (بحوالہ)، اسلوب، سنگ میل پبلشرز لاہور ۲۰۱۲ء، ص ۴۰۔

۳۵۔ بلراج کومل (مقدمہ)، صابر آفاقی، سارے جہاں کا درد، ص ۸۵۔

۳۶۔ احسان دانش، (دیباچہ)، شہر تمنا، صابر آفاقی، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۴ء ص ۷۔

۳۷۔ ایضاً، ص ۹۔

۳۸۔ ایم یامین، بیادِ آفاقی، مشمولہ، دومیل مجلّہ، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج مظفر آباد، ۲۰۱۴ء، ۳۹۱۔

باب سوم

آزاد کشمیر کے منتخب غزل گو شعرا ۲۰۰۰ء سے تا حال

سیدہ آمنہ بہار

مختصر حالاتِ زندگی

سیدہ آمنہ بہار آزاد کشمیر کے ادبی منظر نامے میں ایک معروف شاعرہ کہلاتی ہیں۔ آمنہ بہار نے اپنی ابتدائی شاعری میں ''رونا'' تخلص استعمال کیا لیکن کسی وجہ سے یہ تخلص بدل کر آمنہ ہی رکھ لیا۔ سیدہ آمنہ بہار نے ۲۰۱۶ء میں قرطبہ یونی ورسٹی سے اردو میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر لی تو ان کے نام کے ساتھ ڈاکٹر کا لاحقہ لگ گیا اور ڈاکٹر سیدہ آمنہ بہار ہو گئیں۔ آمنہ بہار کے آباؤ اجداد مقبوضہ کشمیر سے ہجرت کر کے آزاد کشمیر کے ضلع نیلم میں آباد ہو گئے۔ اس ضمن میں آمنہ بہار بتاتی ہیں:

> ''میرا تعلق شاہ موسیٰ سید کے خاندان سے ہے جو جموں میں قاضی القضا تھے۔ (قاضی القضا موجودہ جج کے مساوی ہوتا ہے) ان کے دو بیٹے سید خالق شاہ اور سید عبدالغنی تھے جن میں سے بڑے بیٹے سید خالق شاہ میرے دادا کہلائے۔ تقسیم کے بعد بارہ مولہ سے ہجرت کر کے وہ لوگ آزاد کشمیر کے ضلع نیلم میں آن بسے۔''[۱]

آزاد کشمیر کے ضلع نیلم کے گاؤں دیواریاں میں اس وقت یہ گھرانا علم و ادب میں اپنی مثال آپ تھا۔ سیدہ آمنہ بہار کے والد سید بہارالدین بہار محکمہ تعلیم میں اعلیٰ افسر (ایجوکیشن آفیسر) تھے۔ یہی بات ان کے اولاد کے حق میں بہتر ہوئی کہ ان کی چھے اولادیں ہوئیں اور سبھی تعلیم یافتہ اور اپنے اپنے شعبوں میں نامور ہیں۔ سید بہارالدین بہار نے نیلم کے تعلیمی میدان میں گراں قدر خدمات سرانجام دیں جس کے اعتراف میں حکومت آزاد کشمیر نے ان کے نام پر دیواریاں ہائی اسکول کا نام بدل کر بہارالدین بہار گورنمنٹ بوائز ہائی اسکول رکھ دیا گیا۔

سیدہ آمنہ بہار اپنے پانچ بہن بھائیوں کے بعد ۲۰ فروری ۱۹۶۴ء کو دیواریاں میں ہی پیدا ہوئیں۔ سیدہ آمنہ بہار کی پیدائش کے بعد ان کے والد بہارالدین بہار مظفرآباد منتقل ہو گئے۔ اس شہر میں منتقلی کے باعث ان کا کنبہ بھی ادھر ہی

آ گیا۔سیدہ آمنہ بہار نے ابتدائی تعلیم اسی شہر میں مکمل کی۔دسویں جماعت کا امتحان سٹی ہائی اسکول مظفرآباد کے تحت میر پور بورڈ سے پاس کیا۔اس کے بعد والد واپس نیلم چلے گئے تو آمنہ بہار نے اٹھ مقام سے ہی انٹرمیڈیٹ پاس کیا۔آزاد کشمیر یونی ورسٹی سے بی اے کرنے کے بعد راولپنڈی کے وقارالنساء کالج سے ایم۔اے اردو پاس کیا۔ایم۔اے کے بعد آمنہ بہار نے عملی زندگی کا آغاز کر دیا ان کی علمی تشنگی ابھی کم نہ ہوئی اس لیے علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی سے ایم فل کی ڈگری حاصل کر لی۔۲۰۱۶ء میں آمنہ بہار نے قرطبہ یونی ورسٹی پشاور سے پی ایچ ڈی اردو کی ڈگری مکمل کی۔

سیدہ آمنہ بہار کے والد بھی چوں کہ علم وادب سے شغف رکھتے تھے۔جس بنا پر ان کو یہ چیز ورثے میں ملی تھی محمد کبیر خان کے مطابق:

> ''رونا کے ابو کشمیری میں کھلم کھلا اور اردو میں چپکے چپکے بل کہ چھپ چھپ کے شاعری کرتے ہیں۔ یوں خاندانی شرافت اور سادگی کے ساتھ ساتھ رونا کو شاعری کے بیکٹر یا بھی ورثے میں ملے ہیں۔جن کی پرورش یہ اپنے خونِ جگر سے کرتی ہے۔ چناں چہ شاعری کے جراثیم روز بہ روز تندرست وتوانا ہوتے جا رہے ہیں۔''۲

سیدہ آمنہ بہار نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز نظم سے کیا تاہم ان کی غزل ان کی پہچان بن گئی۔ان کے کلام میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو کسی بھی اچھی شاعرہ کا خاصا ہوسکتی ہیں۔آمنہ بہار کی غزل کے موضوعات خاصے وسیع ہیں۔ آمنہ بہار کی غزل ان کے داخلیت اور خارجیت دونوں پہلوؤں کی حامل ہے۔

فنی جائزہ:

سید آمنہ بہار کی غزل فنی اعتبار سے بھی مکمل اور بھرپور ہے۔صنائع بدائع اور بحروں کا برملا استعمال کرتی ہیں۔سید آمنہ بہار کے ہاں اردو کی تمام مقبول صنعتیں استعمال کی گئیں ہیں۔

صنعت تضاد:

تضاد اردو شاعری کی مقبول ترینفت ہے۔قریباً کوئی بھی شاعر ایسا نہیں جس کے ہاں یہ صفت نہ پائی جاتی ہو یہ صفت کلام میں موسیقیت اور ترنم کا اضافہ کرتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ اکثر شعرا دانستہ طور پر اس کا استعمال کرتے ہیں سیدہ آمنہ

بہار چوں کہ شعری رموز و آہنگ سے آشنا ہیں اس لیے انھوں نے بھی اس صنعت کو بھرپور نبھایا ہے۔ ان کے کلام میں تضاد کی بیسوں مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں۔ یہ لفظی تضاد آمنہ بہار کے ہاں کس طرح استعمال کیا گیا۔ شعری مثالیں دیکھیں۔

اے دوست ہمیشہ تو مجھے یاد رہے گا
تو دِل سے بھلادے مجھے ہاں دِل سے بھلا دے

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ، ص ۴۷)

میں ہنس رہی تھی کہ رو رہی تھی کسی کو بھی علم ہو نہ پایا
بخیر و خوبی گزر گیا وہ، جو گھر سے مقتل کا فاصلہ تھا

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ، ص ۸۶)

خزاں کے زخم بہاروں نے دھولیے آ کر
نگر نگر کو گلوں کی صباحتیں تو ملیں

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ، ص ۹۴)

مراعات النظیر :

مراعات النظیر بھی اردو شاعری کی مقبول صنعت ہے۔ اس صنعت کا استعمال بھی آمنہ بہار نے نہایت چابک دستی سے کیا ہے آمنہ بہار چوں کہ ایک ایسی دھرتی سے تعلق رکھتی ہیں جہاں فطرت جا بہ جا نظر آتی ہے۔ فطرت کے کئی رنگ آمنہ بہار کے ہاں مراعات النظیر کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ پھول، چمن، بلبل کے تذکرے، آسمان، چاند، ستاروں کی باتیں، کوہ، جھرنوں، کوہساروں اور آبشاروں کے قصے آمنہ بہار کی شاعری میں خوش امکان شاعرہ کا پتا دیتے ہیں یہ صنعت آمنہ بہار نے بہت خوب صورت انداز میں نبھائی ہے۔

صبح آزادی کے طائر ہو تجھے منزل نصیب
جو گریں پرواز کے دوران، پروں کو چوم لوں

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ، ص ۳۷)

طائر کی رعایت سے پراوز پرواز مراعات النظیر کی خوب صورت مثال ہے۔

مِرے خیالوں نے جس کو چاہا، وہی تصور ہوا مجسم
وہی غزل ہے، وہی زمیں ہے، وہی ردیف ہےاور قافیہ ہے

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ،ص ۳۷)

غزل کی رعایت سے خیال،تصور، زمیں، ردیف اور قافیہ کا آنا مراعات النظیر ہے۔

نئ فصلوں کی امیدیں اُگی تھیں
فقط جب ملکیت اک ہل رہا تھا

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ،ص ۴۱)

فصل کی رعایت سے اگنا اور ہل مراعات النظیر ہیں۔

ترے گلشن میں آئیں گی بہاریں
لہو سے تو نے سینچا ہے گلوں کو

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ،ص ۴۳)

بہار،گلوں،اور گلشن مراعات النظیر ہے۔

صنعتِ ترافق:

سیدہ آمنہ بہار کی شاعری میں دیگر صنعتوں کے ساتھ صنعت ترافق کی بھی کمی نہیں۔ان کے اکثر اشعار اس صنعت کے حامل ہیں کہ اگر مصرع اولی کو مصرع ثانی اور مصرع ثانی کو مصرع اولی کی جگہ استعمال کرلیا جائے تو اس سے معنوی اعتبار سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور مفہوم برقرار رہتا ہے۔سیدہ آمنہ بہار نے چوں کہ مطالعہ کو بچپن سے اپنا شوق رکھا اور استاد شعرا کے کلام سے بہ خوبی آشنا ہیں۔اس وجہ سے بھی ان کو صنعتوں کے استعمال میں کسی قسم کی کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی۔

جہاں پہ صرف بہتر سے کام چلتا ہو
وہاں پہ لشکر جاہ و سپاہ کیا کرتا

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ،ص ۴۸)

وہاں پہ لشکر جاہ و سپاہ کیا کرتا
جہاں پہ صرف بہتر سے کام چلتا ہو

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ، ص۴۳)

ایسے ہی صنعت ترافق کے حامل مزید اشعار ملاحظہ ہوں:

کب تلک ایسی رواداری نبھائے جائیں ہم
اس طرح ملنا ملانا، دنیا داری اور تھکن

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ، ص۶۷)

رستہ رستہ پھول بچھائے جا سکتے ہیں
وہ آئے تو خواب سجائے جا سکتے ہیں

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ، ص۴۳)

رونے دے گا نہ ہی کھل کر کبھی ہنسنے دے گا
اب کے سینے میں عجب درد اٹھتا ہے سائیں

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ، ص۴۷)

تشبیہات و استعارات:

تشبیہات واستعارات کا استعمال کلام میں ندرت پیدا کرتا ہے۔ص نمبر۵۵ + ۱۵۰ اساتذہ کے کلام کو تشبیہات و استعارات سے مزین کیا۔ یہ چیز شاعری کی جان سمجھی جاتی ہے۔لیکن جب یہ چیز حد سے تجاوز کر جائے تو لطف کی بجائے گرانی طبع کا باعث بن جاتی ہے۔جیسا کہ محمد حسین آزاد لکھتے ہیں:

''بے شک مبالغے کا زور تشبیہ اور استعارے کا نمک زبان میں لطف اور ایک طرح کی تاثیر پیدا کر دیتا ہے۔لیکن نمک اتنا ہی چاہیے کہ جتنا نمک نہ کہ سارا کھانا نمک۔''۳

سیدہ آمنہ بہار کے ہاں تشبیہات واستعارات کا استعمال ایک خاص انداز میں ملتا ہے۔اپنی حد سے کہیں بھی تجاوز نہیں کرتیں۔آمنہ بہار کے ہاں یہ چیز خاص مقدار میں ہے اور بھرپور روایت کی غمازی ہے۔سیدہ آمنہ بہار کے ہاں

تشبیہات واستعارت کے حامل اشعار ملاحظہ کریں۔

میری پلکوں کے بھی حاضر ہیں ستارے جاناں
تم کسی کی سہی ، مانگ سجانے آؤ

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ،ص۵۰)

اس کے دامن کا ستارہ بن گیا
قطر خوں آنکھ میں بے تاب تھا

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ،ص۵۵)

میرے نغمات سلگتے رہے تیری خاطر
تو مگر میرے لیے ابر گریزاں ہی رہا

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ،ص۸۱)

محبوب کو ابر گریزاں سے تشبیہ دی گئی ہے۔

بحروں کا استعمال:

کسی بھی شاعر کے لیے بحروں کے استعمال کی مہارت لازمی ہے اکثر شعرا کے ہاں طویل بحروں کا استعمال زیادہ ملتا ہے لیکن کچھ شعرا ایسے بھی ہیں جنھوں نے مختصر بحر میں نام کمایا۔ جیسے ناصرؔ کاظمی کو چھوٹی بحر کا شاعر کہا گیا۔ میرؔ تقی میرؔ نے طویل بحر کا خوب صورت استعمال کیا ہے۔ اکثر شعرا نے دونوں طرح کی بحریں استعمال کی ہیں۔ سیدہ آمنہؔ بہار کے ہاں طویل بحر کا استعمال کم ملتا ہے۔ لیکن چھوٹی بحر میں ان کا کلام زیادہ اہم ہے۔ سیدہ آمنہؔ بہار کے ہاں چھوٹی بحر کے حامل اشعار ملاحظہ ہوں۔

شہروں کا مکیں جو ٹھہرے
اس کو خود سے جدا نہیں کہتے

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ، ۳۸)

انا زادے نہ شیشے توڑ دِل کے
تیری باتوں میں تو بولے دسمبر

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ،ص۴۱)

صحرا جیسے بے آباد علاقے میں بھی
کیسے کیسے پھول کھلائے جا سکتے ہیں

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ،ص۴۵)

شعر درد کے سفیر
سوچ رت اداس ہے

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ،ص۶۵)

آپ کی یاد کا موسم دِل میں
صحرا میں اک پھول کھلا ہے

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ،ص۶۶)

آمنہ بہار نے گو کہ چھوٹی عمر میں زیادہ طبع آزمائی کی ہے۔تاہم ان کے ہاں طویل بحر بھی ملتی ہے۔طویل بحر سے مثالیں دیکھیں:

جو قصر جان کا امین ٹھہرا دل ونگینہ کا مکین ٹھہرا
اسے میں کیا نام سے صدا دوں، عجیب مشکل سا مرحلہ ہے

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ،ص۱۰۲)

میں ہنس رہی تھی کہ رو رہی تھی کسی کو بھی علم ہو نہ پایا
بہ خیر وخوبی گزر گیا وہ جو گھر سے مقتل کا فاصلہ تھا

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ،ص۱۰۷)

صنعتِ تلمیح:

تلمیح بھی معروف صنعت ہے۔اردوشاعری میں کسی واقعے کوخاص ترکیب میں یوں بیان کردینا کہ پورا منظر آپ کی آنکھوں کے سامنے آجائے تلمیح کہلاتا ہے۔تلمیح کے استعمال کے لیے تاریخی شعور ہونالازمی ہے۔سیدہ آمنہ بہار کے ہاں صنعت تلمیح کا استعمال گوکہ بہت کم ہے تاہم ان کے پاس تلمیح کے حامل اشعار بھی موجود ہیں مثال کے طور پر:

جہاں پہ صرف بہتر سے کام چلتا ہو
وہاں پہ لشکر جاہ و سپاہ کیا کرتا

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ،ص ۲۷)

جہاں کچے گھڑے ٹوٹے تھے میرے
اس دریا سے پانی بھر رہی ہوں

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ،ص ۱۱۰)

کچا گھڑا تھامے ہوئے
میں ڈوبنے کو چل پڑی

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ،ص ۲۳)

تراکیب سازی:

سیدہ آمنہ بہار نے جہاں فنی اعتبار سے صنعتوں کا استعمال کیا اور بحروں کو نبھایا وہیں ان کے ہاں تراکیب کا استعمال بھی کثرت سے ملتا ہے۔تراکیب سازی میں آمنہ بہار نے بہت نفاست کا مظاہرہ کرتے ہوئے اچھوتی تراکیب کا استعمال کیا ہے۔سیدہ آمنہ بہار کے پاس تراکیب سازی دیکھیں:

یہ تیرگی کی بدلیاں یہ میں وہی صدی کے دکھ
سکوتِ شام غم میں کربلا سے دوستی رہی

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ،ص ۲۹)

پھر سے اقوام نمرود و عاد کی صورت نہ ہو
بستی نوعِ بشر کو ایک موقع اور دو

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ، ص۳۳)

میں روائے آرزو کو اوڑھ کر گھر سے چلی
اور میرا رختِ سفر پھرنا صلوں میں گم ہوا

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ، ص۳۶)

وقارِ زیست کی اجلی کرن پہ مرتے ہیں
ہزار جاں سے جو ارضِ وطن پہ مرتے ہیں

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ، ص۱۳۳)

چاہتوں کے عذاب میں رہتے
حلقہ ماہتاب میں رہتے

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ، ص۱۳۶)

کنایہ:

کنایہ کسی بھی شاعر کے فنی کمالات میں اہمیت کا حامل ہے۔ ایسی بات جس میں حقیقت اور مجاز کا عنصر موجود ہو کنایہ کہلائے گی۔ سیدہ آمنہ بہار کے ہاں بھی کنایہ کی مثالیں موجود ہیں۔ کنایہ کی مثالیں درج ذیل ہیں۔

وہ مجھے آزاد کرتا کیا بھلا
وہ تو خود پابستہ زنجیر تھا

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ، ص۵۴)

سرخ حویلی کے در پر اب تالا رہتا ہے
روشن دانوں پر لکڑی کا جالا رہتا ہے

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ، ص۵۷)

مری پہچان بننا چاہتے ہو
مرا پانی پہ گھر ہے سوچ لینا

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ، ص۶۰)

حسن تعلیل:

صنعت حسن تعلیل کا استعمال گو کہ ایک مشکل فن ہے تاہم اکثر شعرا کے پاس یہ فن موجود ہے۔ سیدہ آمنہ بہار کے پاس حسن تعلیل بل کل واضح تو موجود نہیں تاہم ان کے ہاں کسی نہ کسی زاویے سے حسن تعلیل کے اشعار موجود ہیں۔ مثال کے طور پر:

اس کی آبلہ پائی جب سے مرے نام ہوئی
میرے پاؤں پر اس دن سے چھالا رہتا ہے

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ، ص۵۷)

پاؤں میں چھالا ہونے کی حقیقی وجہ کچھ اور ہے لیکن شاعرہ کے مطابق یہ چھالا اس کے محبوب کی طرف سے آبلہ پائی اس کے نام ہونے کی وجہ سے ہوا۔ اسی طرح ایک شعر ملاحظہ ہو:

ہوا میں بارشوں کا نم بدسا ہے
کسی کی چشم تر ہے سوچ لینا ۴

یہاں ہوا میں نمی کی حقیقی وجہ جو شاعرہ نے بیان کی ہے وہ نہیں۔ شاعرہ کے مطابق کسی کی آنکھ میں آنسوؤں کا باعث ہوا میں نمی ہے۔

فکر:

آزاد کشمیر کے متوالے بیان فکری سطح خاصی مضبوط ہے۔ یہاں کے شعرا کا فکری جائزہ لیں تو پتا چلتا ہے کہ یہاں تمام شعرا کی فکر میں مزاحمتی عناصر، کشمیر، مزاح، عصری شعور وغیرہ بدرجۂ اتم موجود ہے۔ مزاحمتی عناصر موجود ہونا اس لیے بھی حیران کن نہیں کہ کشمیری ایک مدت سے اپنی بقا کی جنگ لڑ رہے ہیں اور دشمن کے خلاف مزاحمتی ردعمل کا اظہار کر رہے ہیں۔ اور ادب میں یہ روش نئی نہیں ہے۔ آزاد کشمیر کے ادبی منظر نامے میں سیدہ آمنہ بہار چوں کہ یہاں کے حالات سے بہ

خوبی واقف ہیں۔ان کی پہلی کتاب ''چناروں کی آگ'' میں بھی اس تناظر سے بے شمار اشعار ملتے ہیں۔ان کی شاعری میں کشمیر کے متعلق جذبات کی نمایاں چھپ دکھائی دیتی ہے۔پروفیسر مسرت صبوحی کے مطابق:

''ہم عام طور پر آمنہ بہار رونؔا کی شاعری سے بہت بلند توقعات وابستہ کر سکتے ہیں،ارضِ وطن کشمیر کے لیے ان کے جذبات کو نہ صرف حساس ترین بل کہ شدید ترین بھی کہا جا سکتا ہے اور مادر وطن اور ابنائے وطن کے لیے جذبات کی یہی شدت سے خوب صورت شاعرہ بنا دیتی ہے۔رونا کی شاعری میں بہترین وصف یہ ہے کہ وہ اپنا جذبہ کھلے الفاظ میں بیان کر دیتی ہیں۔انھوں نے شاعرانہ بناوٹ سے کام نہیں لیا۔ان کے جذبے سچے اور نکھرے ہیں۔اگر چہ رونا اس میدان میں نو وارد ہیں لیکن ان کے اشعار میں بے ساختگی، سچائی اور سچے جذبوں کا اظہار ہے۔ان کی شاعری چناورں کی آگ کا شعلہ بھی ہے۔کشتِ زعفران کی ذرخیزی بھی ڈل کا سکوت اور جہلم کی روانی بھی ہے۔وہ کشمیر کی ایسی بیٹی ہے جس نے کشمیر کے کرب کو بہت شدت سے محسوس کیا ہے۔''۵

میں اپنے پاؤں کی زنجیر کو لکھوں زیور
یہ حکم مل تو گیا ہے مگر جھکاؤ کے ساتھ ۶

یہاں آمنؔہ بہار کے ہاں مزاحمت کا رنگ کس قدر ہے کہ پاؤں کی زنجیر کو زیور کہہ رہی ہے ہیں۔

جن پہ سر کٹ کے گرے ان راستوں کو چوم لوں
میں شہیدوں کے لہو کی عظمتوں کو چوم لوں

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ،ص ۳۷)

جن میں آزادی کی خواہش کب سے ہو گرم سفر
برف زاروں کے فرو تر سلسلوں کو چوم لوں

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ،ص ۳۷)

مذہبی شعور:

سیدہ آمنہ بہار ایک مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں۔ اسلام اور مذہب سے گہری وابستگی ہے۔ آل رسول ﷺ سے بے پناہ محبت سیدہ آمنہ بہار کو ورثے میں ملی ہے۔ ان کے کلام میں مذہبی رنگ کی کوئی کمی نہیں۔ شاعر کے لیے اس کے جذبات اور احساسات ہی بنیادی محرک ہوتے ہیں۔ جیسا جذبہ کارفرما ہوگا شاعری میں وہی رنگ نمایاں ہوگا۔ آزاد کشمیر کے شعرا نے اپنے کلام میں مذہبی عناصر کو عمدگی سے نبھایا ہے۔ آمنہ بہار کے ہاں یہ جذبہ بہت نکھرا ہوا اور سچا ہے جیسا کہ ناصر زیدی لکھتے ہیں۔

> ''رونا، پروین شاکر کے بعد ایک اور انتہائی خوب صورت شاعرہ ہیں جن کے ہاں جذبے سچے، نکھرے اور تازہ ہیں۔''[7]

سیدہ آمنہ بہار کے مذہبی رنگ میں رنگے یہ اشعار دیکھیں:

دہر کا تو ہے خالق و مالک
خوب صورت ہے ضابطہ تیرا

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ، ص۱۳)

تو سمایا ہے میری دھڑکن میں
اور مسکن ہے ماورا تیرا

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ، ص۱۳)

ہزار بار ہو تجھ پر درود اور سلام
شبِ سیاہ میں تجھ کو ہی چارہ گر دیکھوں

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ، ص۱۴)

غروب درد و الم ہو تو شافع محشر
طلوع کلمۂ طیبہ کی وہ سحر دیکھوں

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ، ص۱۴)

مرے امامؑ نظر میں ہے آج تک ٹھہرا
اداس شام غریبان کا خونچکاں منظر

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ، ص ۳۸)

سیدہ آمنہ بہار کی شاعری اس بات کی غمازی ہے کہ کشمیری شعرا مذہب سے بھی بھرپور وابستگی رکھتے تھے۔ سیدہ آمنہ بہار کے ہاں حمدیہ ونعتیہ کے ساتھ سلام ومرثیہ کے اشعار بھی ملتے ہیں۔ ان کی شاعری میں جدت اور تنوع کا احساس ہوتا ہے اور خدا اور اس کے رسول کے متعلق ان کی پختہ یقینی اور عقیدت کا مکمل اظہار ملتا ہے۔ سیدہ آمنہ بہار نے حمد ونعت کے مضامین کو جدید عصری اور فکری حیثیت کے ساتھ ساتھ ایک نئے پن اور تخلیقی تازگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ کربلا اور صاحبِ کربلا کا حوالہ بھی آزادی کشمیر کے مزاحمتی رنگ کی وجہ سے مقبول رہا۔ یہی وہ ظلم وستم تھا جس نے دنیا کی تاریخ کو بدل کر رکھ دیا۔ ہمارے شعرا اور ادبا نے بھی واقعۂ کربلا کو حق وباطل کا زبردست معرکہ کہا۔ یہ ایسا واقعہ تھا جس کی مثال تاریخ اسلام میں ملنا مشکل ہے۔ رزم گاہِ کربلا کے عظیم ہیرو حسین ابن علیؓ کی بہادری وشجاعت کے قصے ہمارے اردو ادب میں جابجا نظر آتے ہیں۔ سیدہ آمنہ بہار نے بھی اپنے مذہبی جذبات کا اظہار خوب صورتی اور ندرت سے کیا ہے۔

دستِ امید میں نے پھیلایا
بے بسی میں ہے آسرا تیرا

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ، ص ۱۳)

میں زخم خوردہ ہوں دنیا کی بے ثباتی کی
حیات پاک کو تیری ہی معتبر دیکھوں

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ، ص ۱۴)

سید المرسلین کے نگر کا سفر
جذبہ شوق کی انتہا کا سفر

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ، ص ۴۹)

مرے امامؑ کے پیاروں کی پیاس کیوں نہ بجھی
بتاؤ تم نے سنی کیا نہ العطش کی صدا

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ، ص ۳۸)

صوفیٔ شہر کا پیغام ملا ہے مجھ کو
مری خاطر کوئی اچھا سا قصیدہ لکھو

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ، ص ۱۳۶)

رجائیت:

کشمیری شعرا کے بارے ایک عام خیال یہ بھی ہے کہ ان کے ہاں حزینہ رنگ یا قنوطیت کا رنگ واضح ہے لیکن یہ بات سو فیصد درست نہیں ہے۔ شعرائے آزاد کشمیر نے جہاں ظلم و بربریت کے خلاف مزاحمت کی، درد و الم کے قصے رقم کیے اور اپنے غموں کا اظہار کیا وہیں اس بات کی امید بھی ظاہر کی کہ ظلم کے اندھیرے چھٹیں گے اور امن کی روشنی پھوٹے گی۔ آزاد کشمیر کے شعرا کے ہاں یہ امید و رجائیت کا رنگ زیادہ حیران کن امر بھی نہیں۔ یہاں کے باسیوں کے حوصلے ان پہاڑوں کی طرح بلند اور مضبوط ہیں۔ آزاد کشمیر کی شاعری میں رجائی مزاج کافی نمایاں ہے۔ سیدہ آمنہ بہار کے ہاں رزمیہ رنگ اور مزاحمتی رنگ کی وجہ سے رجائی لہجہ بھی کم یاب نہیں۔ ان کے ہاں نشاطیہ انداز اور رجاتی آہنگ موجود ہے۔ سیدہ آمنہ بہار کے ہاں اچھے دنوں کی امید خود شاعر کی ذات کی بہ جائے پورے نظام اور پوری قوم سے بندی ہوتی ہے۔ سیدہ آمنہ بہار کے ہاں رجائیت کے حامل اشعار دیکھیے:

کون کہتا ہے ہم میں دوری ہے
سلسلے دوریوں کے جھوٹے ہیں

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ، ص ۲۳)

وہ جاتے جاتے پھر مجھے زخم دے گیا
کہ جیسے تیرہ جنگلوں میں چاند رات رہ گئی

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ، ص ۴۲)

گر چاند ستارے جو میسر نہ ہوں روٓنا
تو سرخ گلابوں سے گھر اپنا سجادے

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ، ص۴۷)

درد جانا زندگی کا دوسرا مفہوم ہے
پیار کرنے کی تمنا فطرتاً معصوم ہے

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ، ص۵۲)

سیدہ آمنہ بہار کے ان اشعار کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے مشکلات کے ہوتے ہوئے بھی امید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ وہ اس بات سے مکمل پر امید ہیں کہ خوشیاں ان کا دامن آن پکڑیں گی۔ ان کے ہاں امید کے مضامین کو بدلی ہوئی صورت میں استعمال کیا گیا ہے۔ سیدہ آمنہ بہار کی غزل میں امید ورجائیت کے مضامیں زیادہ نمایاں طور پر سامنے آتے ہیں۔

شب گزیدہ آنکھوں کو پر نور رہنا چاہیے
خواب وادی میں کوئی محصور رہنا چاہیے

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ، ص۵۷)

وعدہ کر توڑ،فکر، چھوڑ بہانے مت کر
ایسی باتوں پہ میں غم ناک نہیں بھی ہوتی

(سیدہ آمنہ بہار، غیر مطبوعہ)

عصری شعور:

آزاد کشمیر دنیا کے نقشے میں ایسا خطہ ہے۔ جو اپنے خاص محلِ وقوع کی بنا پر رسل و ابلاغ کے مسائل سے دو چار رہا ہے۔ لیکن ان تمام مسائل کے باوجود یہ بھی حقیقت ہے کہ سیاسی و سماجی طور پر اس خطے کے شعرا میں جو عصری شعور پایا جاتا ہے۔ وہ دیگر علاقوں میں شاید کم ملے۔ اس عصری شعور کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ریاست میں خواندگی کا تناسب بہت زیادہ ہے۔ آزاد کشمیر کے اکثر دیہات ایسے ہیں جہاں شرح خواندگی سو فی صد ہے۔ حال ہی کی ایک رپورٹ کے مطابق

آزاد کشمیر کے ضلع حویلی کے گاؤں جبی سیداں میں ہر فرد کم ازکم ایم فل کی سطح تک تعلیم یافتہ ہے۔اسی طرح ضلع نیلم میں بھی خواندگی کا تناسب بہت زیادہ ہے۔آزاد کشمیر کے شعرا کے ہاں عصری شعور پورے جنوبی ایشیا میں زیادہ ہے۔آزاد کشمیر کے شعرا کسی بھی سماجی یا عالمی واقعے سے بے خبر نہیں رہے۔سیدہ آمنہ بہار کا تعلق چوں کہ ایک علمی وادبی گھرانے سے ہے۔ان کے ہاں اخبارات ورسائل کا مطالعہ بھی باقاعدگی سے ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ آمنہ بہار کے ہاں عہدِ حاضر کے رویے اپنے بھرپور تناظر میں موجود ہیں۔ان کی شاعری میں اپنے عہد کے تمام تر مسائل کا ادراک موجود ہے۔چاہے دنیا کے کسی بھی حصے میں کوئی مسئلہ ہوا سیدہ آمنہ بہار نے اسے بیان کیا۔قومی اور عالمی منظرنامے کا پرتو آمنہ بہار کے ہاں بہ کثرت نظر آتا ہے۔

یہ تیرگی کی بدلیاں یہ بیں ویں صدی کے دکھ
سکوت شام غم میں کربلا سے دوستی رہی

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ، ص۲۹)

اہل درماں کاروبار اور وحشی ہو گئے
ایٹمی دنیا میں ممکن کب مسیحا کا ورد

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ، ص۲۳)

مرا ہے ہیں آج بھی فاقوں سے انسان دہر میں
لٹ چکی جن کی معشیت کٹ گیا تارِ حیات

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ، ص۳۲)

سیدہ آمنہ بہار معاشی عدم مساوات کے خلاف آواز بلند کرنے والوں میں نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ان کے ہاں ایک مخصوص قسم کی فکری رجعت پسندی دکھائی دیتی ہے انھیں بھوک وننگ کے ہوتے ہوئے سائنسی ترقی اور تسخیر قمر بھی ایک عیاشی محسوس ہوتی ہے۔آمنہ بہار ایٹمی دنیا سے بھی خائف نظر آتی ہیں۔وہ اس بات کا بھی مکمل ادراک رکھتی ہیں کہ آج کل کے دور میں اخلاص اور وفا ناپید ہے۔سیدہ آمنہ بہار کے ہاں عصری شعور کے حامل چند مزید شعر دیکھیں:

خواہشوں کی بھیڑ میں اخلاص کے رشتے کہاں
آج کل ہر شخص اپنی ذات کا محکوم ہے

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ، ص ۵۲)

پس رہے آج بھی حالات میں
کتنے پنوں اور تکنی سیساں

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ، ص ۸۵)

قنوطیت:

اردو شاعری کا مزاج ابتدا سے ہی قنوطیت کا حامل ہے۔ میر تقی میرؔ فانیؔ بدایونی، ناصرؔ کاظمی بڑے قنوطی شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ آزاد کشمیر کے شعرا کے ہاں چوں کہ غم والم کے قصے نئے نہیں اس لیے شعرا کے ہاں قنوطی رنگ نمایاں ہوتا کوئی مشکل امر نہیں۔ سیدہ آمنہؔ بہار کے ہاں امید کے ساتھ ساتھ غم کا پہلو بھی واضع ہے جیسا کہ سید سبطؔ احمد لکھتے ہیں:

''اکثر اردو شاعرات کے ہاں جو سطحی جذبات پائے جاتے ہیں رونا کی شاعری میں اس کا شائبہ بھی دکھائی نہیں دیتا اس کے برعکس ان کے ہاں سچے اور گہرے جذبات کا بھرپور احساس ملتا ہے۔ وہ اپنی شاعری میں امید اور ناامیدی کے جس دوراہے پر کھڑی ہیں اسے انھوں نے ایک خوب صورت اور گہرے جذبے کا روپ دیا ہے۔ امید رونا امیدی کا یہی دکھ ان کا سب قیمتی اثاثہ ہے جو انھیں ورثے میں ملا ہے۔''۸

اداسی ایک رویہ نہیں بل کہ ایک کیفیت کا نام ہے۔ کشمیری شعرا کے ہاں حزن وملال کے موضوعات کی کمی نہیں ہے۔ ان کی شاعری مایوسی اور ناامیدی سے عبارت ہے۔ سیدہ آمنہؔ بہار کے ہاں دکھوں کی مختلف صورتیں اور کیفیات ہیں ان کو کہیں وطن کا غم کھائے جا رہا ہے تو کہیں محبت کے کرب میں مبتلا ہیں۔ سیدہ آمنہؔ بہار ایک شاعرہ ہیں اور شاعروں کے اندر فطری طور پر حساسیت موجود ہوتی ہے۔ آمنہؔ بہار کے اندر بھی ٹوٹ پھوٹ کا عمل مختلف صورتوں میں جاری ہے لیکن یہ بات قابل توجہ ہے کہ عورت ہو کر بھی انھوں نے اپنے غموں کو خفیہ نہیں رکھا بل کہ خاص انداز میں اپنے شعروں میں اس کا اظہار کر دیا ہے۔ عطاالحق قاسمیؔ کے مطابق:

''میں اس حیرانی سے مسلسل دوچار رہا کہ آزاد کشمیر کے ایک انتہائی پسماندہ گاؤں میں پیدا ہونے والی یہ لڑکی شاعری کے رموز سے کیسے آگاہ ہوئی؟ اس نے اپنے دل میں اتنے سارے غم کیسے سمیٹے اوران کوشعروں کا روپ میں کیوں کر ڈھالا؟ ۹

سیدہ آمنہ بہار کے شعروں میں ان کی مشکلات کا نوحہ اوران کے غموں کا رنگ بل کل نمایاں ہے۔ان کی شاعری میں ناامیدی کے سائے منڈلاتے ہیں۔سیدہ آمنہ بہار اپنے ہم وطنوں کے دکھ کو محسوس کرتی ہیں، اپنی دھرتی پر ہونے والے ظلم کومحسوس کرتی ہیں۔ وہ آزادی کی طویل اورتھکا دینے والی جدوجہد کودیکھ اس کا اظہار کرتی ہیں۔سیدہ آمنہ بہار اپنی ناکام محبت کا رونا روتی ہیں۔ وہ محبوب کی بے وفائی کوشکوہ بھی بہت نفاست سے کرتی ہیں ان کی زبان آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہے۔غزل کی روایت میں خزینہ رنگ بہت مضبوط ہے۔سیدہ آمنہ بہار اس دولت سے جڑی ہوئی ہیں جس میں قنوطیت کے مظاہر نمایاں ہیں۔ان کے ہاں قنوطیت کا رنگ دیکھیں۔

نظر اٹھی تو میرے قاتلوں میں شامل تھا
گئی رتوں میں ملا تھا جو دل کے گھاؤ کے ساتھ ۱۰

میں تیرے دریا کے بدلے
اپنی پیاس کبھی نہیں دوں گی ۱۱

سیدہ آمنہ بہار کے ہاں درد کی یہ کیفیات نئی نہیں ہیں۔ وہ پیدائش سے ہی ایک عجیب طرح کے کرب میں مبتلا رہی ہیں۔ وہ کرب ان کے ہم وطنوں کا ہے جو جن پر بھارتی جارحیت کی جانب سے ظلم کے پہاڑ ڈھائے جا رہے ہیں۔

ظلمتوں کی جان لیوا اسی ہوائے تیز میں
جو ابھی تک جل رہے ہیں ان دیوں کو چوم لوں

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ، ص ۳۷)

قسطوں کی ہم موت مرے ہیں
قطرہ قطرہ زہر پیا ہے

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ، ص ۶۶)

مسکراؤں کیسے میں کچھ سمجھ نہیں آتی
دردوغم کے صحرا میں چار سو اداسی ہے

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ، ص ۸۴)

اسلوبیاتی جائزہ:

کسی بھی شاعر کا منفرد اسلوب بننا کوئی آسان نہیں ہوتا۔ اُسلوب کسی بھی شاعر کی فکری سطح اور معاشرتی اونچ نیچ کو سامنے رکھ کر ترتیب پاتا ہے۔ انفرادیت میں خوبیاں اور خامیاں دونوں ہوسکتی ہیں جن کی بنا پر اسلوب پیدا ہوتا ہے۔ شعرا کے ہاں ان کے تمام تر پہلوؤں کو مدنظر رکھ کر ان کا اسلوب وضع کیا جاتا ہے۔ اسلوب میں جہاں طرز نگارش کی انفرادیت ضروری ہے وہیں بات یہ بھی ہے کہ اسلوب کے بارے میں جو کہا جاتا ہے مصنف کی شخصیت کا دوسرا نام اسلوب ہے یہ مکمل سچائی پر مبنی نہیں ہوسکتا۔ اکثر یہ بات غلط بھی ثابت ہو جاتی ہے یہ بات بھی اہم ہے کہ اچھا اسلوب روایت سے ہٹ کر اس صرف جدت کے ذریعے بھی پیدا نہیں ہوسکتا۔ بل کہ روایت کے ساتھ رہ کر ہی عمدہ اسلوب سامنے آسکتا ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا کہ سیدہ آمنہ بہار روایت سے مکمل طور پر جڑی ہوئی ہیں ان کے ہاں جدیدیت کا رنگ کم ہے۔ ان کے ہاں بعض انفرادی خصوصیات کے علاوہ کچھ زاویے اور رجحانات ایسے ہیں جو خطہ کشمیر کے تمام شعرا کے ہاں موجود ہیں۔ مثال کے طور پر آزاد کشمیر کا کوئی شاعر ایسا نہیں جس نے تحریکِ آزادیٔ کشمیر کو بالائے طاق رکھتے ہوئے شاعری کی ہو یا پھر اس کے ہاں خاص علامات مثلاً جھیل ڈل، چنار، نیلم یا جہلم وغیرہ موجود نہ ہو۔ فطری طور پر آزاد کشمیر کے شعرا ان چیزوں سے الگ نہیں رہ سکتے۔ آزاد کشمیر کے شعرا کے ہاں مزاحمتی شاعری بھی ایک لحاظ سے اسلوب کا حصہ بن گئی۔ یہاں تک کہ شعرائے آزاد کشمیر کے شعری مجموعوں کے نام بھی ایسے ہی ہو گئے جن سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان کا تعلق وادیٔ کشمیر سے ہے۔ مثال کے طور پر ’’لہولہو کشمیر‘‘ افتخار مغل کا مجموعہ ’’چناروں کی آگ‘‘ آمنہ بہار کا مجموعہ، یا صغیر قمر کا مجموعہ ’’کشمیر کے چراغ‘‘ وغیرہ۔

سیدہ آمنہ بہار کا کلام اسلوبیاتی اعتبار سے اس اسلوب کا حامل ہے جو اجتماعی طور پر آزاد کشمیر کے شعرا کا اسلوب

ہے۔آمنہ بہار کی شاعری میں مزاحمت کا عنصر بھی موجود ہے اور طربیہ رنگ بھی نمایاں ہے۔آمنہ بہار کے ہاں لفظیاتی اشاراتی اور علامتی رنگ کے ساتھ فکری نظام میں بھی اسلوب کی جدت اور انفرادیت نظر آتی ہے ان کی شاعری نیلم کے بلندو بالا پہاڑوں سے طلوع ہوتی ہے اور نیلم کی تیز وتند لہروں سے ہوتی ہوئی ملک کے کونے کونے میں پھیل جاتی ہے۔سیدہ آمنہ بہار کے ہاں وطن سے محبت کا رنگ بنیادی حوالہ ہے جس نے ان کی شاعری کو شہرت بخشی ۔سیدہ آمنہ بہار نے جس علاقے اور جس سماجی پس منظر میں شاعری شروع کی اس کو دیکھتے ہوئے یہ بات تسلیم کرنا آسان ہے کہ آمنہ بہار کی فن کے ساتھ ان کی گہری وابستگی کا ادراک ہوتا ہے۔اپنی فنی زندگی کے لیے ان کی بے پناہ جدوجہد بھی اس بات سے عیاں ہو جاتی ہے۔ سیدہ آمنہ بہار اردو ادب میں شاعرات کی روایت کے ساتھ بہت مضبوطی سے جڑی ہوئی شاعرہ ہیں۔عورت کے مسائل اس کے جذبات اور نفسیاتی مسائل آمنہ بہار کی شاعری میں خاص عناصر ہیں۔انھوں نے عالمی ،سیاسی ،سماجی اور نفسیاتی مسائل سے اپنی شاعری کو مزین کیا۔گو کہ ان کے ہاں ان موضوعات پر کہیں کہیں کمزوری کا بھی احساس ہوتا ہے۔لیکن یہ بات بھی اہم ہے کہ یہ موضوعات ان کی شاعری کو موضوعاتی اعتبار سے تنوع بخشتے ہیں۔

سیدہ آمنہ بہار کے ہاں ان کے فنی جوہر عشقیہ مضامین کے حامل کلام میں زیادہ کھل کر سامنے آئے ہیں۔غزل میں ان کے مضامین نظم کی نسبت زیادہ کمزور نظر آتے ہیں۔وہ اپنے محبت کے طلسم کا لبادہ اوڑھے اپنی غزل میں جذباتی انداز میں دکھائی دیتی ہیں۔آمنہ بہار اپنی غزل کے خارجی پہلوؤں کو سنوارنے اور چمکانے میں کارفرماعمل دکھائی دیتی ہیں ان کی غزل میں یہ کوشش موجودہ عہد کے شعری رویوں کی اور لسانی پہلوؤں کی روشنیوں میں ماند پڑ جاتی ہے۔وہ علامات کے معاملے اور تراکیب سازی میں بہت محتاط واقع ہوئی ہیں آمنہ بہار کے ہاں تخلیقی جواہر کے حوالے سے آزاد کشمیر کی ایک ثروت مند شاعرہ ہیں وہ ایک خوش خیال اور جمال دوست شاعرہ کے روپ میں بھی اپنا منفرد مقام رکھتی ہیں۔سیدہ آمنہ بہار ہمیشہ عمدہ اور بہترین موضوعات کا انتخاب کرتی ہیں۔سیدہ آمنہ بہار آزاد کشمیر کے شعری منظرنامے میں حسین فکر اور جمال پرست شاعرہ کے طور پر سامنے آئی ہیں۔ان کا بھرپور تخلیقی جوہر ان کی بھرپور اور مثبت تخلیقی جہت کا آئینہ دار ہے۔مجموعی طور پر سیدہ آمنہ بہار نے محبت کے مضامین کی حدتاک اپنا ایک الگ اسلوب قائم کرلیا ہے۔جس کی بنا پر وہ آزاد کشمیر کی ادبی تاریخ میں مقبولیت حاصل کر چکی ہیں۔آزاد کشمیر کی نوآموز شاعرات شعوری طور پر ان کے اسلوب کی پیروی کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ سیدہ آمنہ بہار کا شعری سفر کم وبیش تین دہائیوں پر مشتمل ہے۔یہ سفر کوئی کم نہیں ہے اس لیے ان کے ہاں ادب کے تمام رنگ

ملتے ہیں۔سیدہ آمنہ بہار ادبی محافل میں خاص پہچان رکھتی ہیں۔ ریاست سے باہر آزاد کشمیر کے جن شعرا نے شناخت بنائی ان میں آمنہ بہار ایک اہم نام ہے۔آمنہ بہار روز بہ روز اپنے اسلوب میں بہتری کی طرف گامزن ہیں۔ان کے شب و روز محنت کی بدولت ان کی آواز انفرادیت کی حامل ہو چکی ہے۔اپنی جدید فکر، نقطہ نظر کی مدلل مدافعت اور شعر کے ظاہر و باطن پر خصوصی توجہ نے سیدہ آمنہ بہار کو ممتاز مقام عطا کیا ہے سیدہ آمنہ بہار کے شعری اسلوب کے حوالے سے اختر امان لکھتے ہیں:

''آمنہ کی شاعری کا مطالعہ کیا تو اس کے دوران ہی یہ بات سامنے آئی کہ اگر فن سے سچی لگن ہو تو کوئی بھی فن کار اجارہ دار ادبی مراکز سے خواہ کتنا ہی کیوں دور نہ ہو وہ ایک وقت آنے پر اپنا مقام بنا ہی لیتا ہے۔آمنہ کے مجموعے کا مطالعہ کیا تو اس کے دوران بھی یہی بات ہمارے سامنے آئی کہ اس کی شاعری بھی تین بڑے دائروں سے عبارت ہے اس کی شاعری میں ایک سب سے بڑا دائرہ اس کی اپنی ذات کا ہے جس کے حوالے سے وہ اپنے غموں اور خوشیوں، محبتوں اور نفرتوں، یادوں اور کبھی نہ فراموش کر دینے والے جذبوں کا اظہار کرتی ہے۔ان کی شاعری کا یہ دائرہ زیادہ تر غزل کے اشعار میں نمایاں ہو کر سامنے آیا ہے۔جب کہ ان کی شاعری کا دوسرا دائرہ کشمیر اور کشمیر کی آزادی، شہدا کی قربانیوں کے حوالے سے کی جانے والی شاعری ہے۔۔۔آمنہ کی شاعری میں تیسرا دائرہ ان عالمی واقعات پر ردعمل سے عبارت ہے جو دنیا کے خطوں میں رونما ہوتے ہیں اور انسانوں کے حقوق کے لیے جدو جہد کے چراغ جلا کر ظلم کے اندھیروں میں گم ہو جاتے ہیں۔آمنہ نے ظلم کے خلاف جدو جہد کے ان جذبوں کو انسانی ہم دردی کے جذبے کے حوالے سے اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے۔''۱۲

وہ ایک شخص عارضی مسرتوں میں گم ہوا
ردائے غم کو اوڑھ کر اسے میں ڈھونڈتی رہی

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ، ص ۲۸)

نیم مردہ سی صدا میں یک بہ یک سب نے کہا

وہ چاند نکلا ہے مگر اب کے بھی گہنایا ہوا

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ،ص۳۰)

مر رہے میں آج بھی فاقوں سے انسان دہر میں

لٹ چکی جن کی معیشت کٹ گیا تارِ حیات

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ،ص۳۲)

حویلی ہے کہ اک عورت اکیلی

سرائے ہے کہ بھوتوں کا مکاں ہے ۱۳

سیدہ آمنہ بہار پر شاعری میں کئی بڑے لوگوں کا اثر بھی نمایاں طور پر موجود ہے۔انھوں نے بعض تحریکوں،تنقیدی دبستانوں کے علاوہ ادبی وشعری رویوں اوراہم شخصیات سے بھی اثر لیا ہے۔کوئی بھی شاعر جس کی اردو شاعری کی تاریخ اور روایت پر گہری نظر ہو وہ اس کے اثر سے بچ کر نہیں چل سکتا۔غالب واقبال،میر وسودا کے اثرات سے بچنا شعرا کے لیے ممکن نہیں۔سیدہ آمنہ بہار کے ہاں بھی اساتذہ کے اثرات موجود ہیں۔انھوں نے شعرا کی زمینوں کا استعمال تو کم کیا ہے لیکن اثرات سے نہیں نکل پائیں۔سیدہ آمنہ بہار کے ہاں یہ اثرات ملاحظہ ہوں؛

غالب کا رنگ:

دل کے بہلانے کو یونہی ایک نام لکھ دیا

جو جواب آئے گا ان کا وہ مجھے معلوم ہے

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ،ص۵۲)

غالب کا مضمون:

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں

میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

(مرزا غالب، دیوان غالب،ص۹۵)

فراز کا رنگ:

میری آنکھوں کو نئے خواب دکھانے آؤ
شمعِ امید ملاقات جلانے آؤ

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ، ص ۵۰)

فرازؔ کا شعر:

رنجش ہی سہی دل ہی دکھانے کے لیے آ
آ پھر سے مجھے چھوڑ کے جانے کے لیے آ

(احمد فراز، شہرِ سخن آراستہ ہے (کلیات)، ص ۳۰)

حبیب جالبؔ کا اثر:

جو پرندہ رقص کے آداب سے واقف نہ ہو
اس کو قصر شہنشاہ سے دور رہنا چاہیے

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ، ص ۵۷)

جالبؔ کا شعر:

تو کہ ناواقف آداب غلامی ہے ابھی
رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے

(حبیب جالب، کلیات حبیب جالب، ص ۸۸)

سیدہ آمنہؔ بہار کا یہی وصف ہے کہ ان کے اشعار میں تصنع اور بناوٹ کا شائبہ نہیں ملتا۔ وہ اپنی شاعری میں اپنے جذبات کا اظہار اپنے خاص انداز اور خاص رنگ میں بہت آسانی سے کر جاتی ہیں۔ آمنہؔ بہار کے اس وصف کے حوالے سے اعتبار ساجدؔ رقم طراز ہیں:

''روناؔ کی شاعری کے سنہری اوصاف میں ایک چمکیلا وصف یہ ہے کہ اس نے اپنے مافی الضمیر کے بیان میں کسی شعوری بناوٹ سے کام نہیں لیا۔ حرف کو اس کے اس اصل گداز، خستگی، حرارت اور معصومیت کے ساتھ ذہین کی شہ نشیں سے

کاغذ کی بارہ دری تک نہایت دیانت، خلوص اور انہاک سے پہنچایا ہے۔''۱۴

آمنہ بہار کے ہاں اسلوبیات کے اس تجزیے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ہاں مختلف شخصیات کے ملے جلے اثرات موجود ہیں۔ شاعرات میں پروین شاکر کا لہجہ بہت مقبول ہوا تاہم آزاد کشمیر کی نسوانی آوازوں میں آمنہ بہار کا لہجہ منفرد اور الگ تھلگ ہے۔

افتخار مغل

حالات زندگی

۷ جنوری ۱۹۶۱ء کو آزاد کشمیر کے ضلع مظفر آباد کے مضافاتی گاؤں مشثمبہ میں پیدا ہونے والے افتخار حسین نے ادبی دنیا میں افتخار مغل کے نام سے اپنی شناخت بنائی۔ افتخار مغل نے شہر سے دور رہ کر اپنی پہچان قائم کی۔ ابتدائی تعلیم گاؤں کے اسکول سے ہی حاصل کی۔ علم کی لگن میں روزانہ چھ گھنٹے پیدل مسافت طے کر کے اسکول جاتے اور واپس آتے۔ افتخار مغل کی ذات میں اللہ تعالیٰ نے کئی طرح کی خصوصیات رکھ دی تھیں۔ ابتدا ہی سے غیر معمولی ذہانت کے باعث ہم نصابیوں سرگرمیوں میں پیش پیش رہتے۔ گھر میں والدہ نے جو تربیت کی وہ افتخار مغل کی شخصیت میں تا عمر ساتھ سات رہی۔ سخت محنت اور خودداری ان کی سرشت میں شامل تھی جو انھوں نے اپنی والدہ سے حاصل کی۔ افتخار مغل نے اس کا اظہار یوں کیا:

> ''میری والدہ پڑھی لکھی نہیں تھیں لیکن پھر بھی انھیں فارسی پر کافی عبور تھا۔ مجھے یاد ہے کہ وہ
> نانا کو خط فارسی میں لکھا کرتی تھیں۔ انھوں نے مطالعے کے لیے کافی زور دیا میں سمجھتا ہو
> ں کہ میرے اندر یہ علم سے محبت ان ہی کی بدولت ہے۔''۱۵

۱۹۷۵ء میں افتخار مغل نے قریبی قصبہ چکار کے ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اس سال میٹرک کے امتحان میں شامل طلبہ میں واحد افتخار مغل تھے جنھوں نے کامیابی سمیٹی۔ اپنے اندر علم کی تشنگی لیے ہوئے افتخار مغل نے اپنے مستقبل کے لیے سخت محنت کی۔ ۱۹۷۷ء میں انٹر کالج چکار سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۸۱ء میں پنجاب یونی ورسٹی سے گریجویشن کیا۔ بی۔ ایڈ کی ڈگری ۱۹۸۳ء میں آزاد جموں وکشمیر یونی ورسٹی سے مکمل کی۔ ۱۹۸۴ء میں پنجاب یونی ورسٹی سے ہی ایم۔ اے اردو کی ڈگری حاصل کی اور اپنے ذوق کے باعث ۱۹۹۳ میں ایم۔ اے پنجابی میں گولڈ میڈل حاصل

کیا۔۱۹۹۴ء میں فاضل اردو کی اضافی ڈگری حاصل کی۔

۱۹۷۴ء میں بہ طور مدرس تعینات ہونے والے افتخار مغل نے اپنی ملازمت کے لیے بھی اعلیٰ سے اعلیٰ عہدہ ڈھونڈا اسسٹنٹ پروفیسر اور ایڈیشنل سیکرٹری کے بعد ۲۰۱۱ء میں ڈائریکٹر میاں محمد بخش لائبریری تعینات ہوئے۔افتخار مغل نے اپنی ملازمت کے دوران ہی اپنی تعلیم بھی جاری رکھی ۱۹۹۵ء میں علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی سے ایم فل اردو اور ۲۰۰۳ء میں علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی ہی سے پی ایچ ڈی اردو کر کے اہم سنگ میل عبور کیا۔افتخار مغل ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔غزل، نظم، مضامین، ریوتاژ، تنقید اور تحقیق ہر میدان میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔احمد ندیم قاسمی سے خاص عقیدت رکھتے تھے میر کے معتقد تھے احمد فراز اور غالب سے دلی وابستگی تھی۔ان کے کلام میں اَساتذہ کی جھلک نظر آتی ہے۔ازدواجی زندگی میں دو شادیاں کر رکھی تھیں دوسری اہلیہ ڈاکٹر تبسم صدیقی بھی شاعرہ ہیں جن کا مجموعہ کلام ''اوڑھنی کے رنگ'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔اولاد میں دو بیٹے اور پانچ بیٹیاں منکوحہ اول سے ہی ہیں۔افتخار مغل نے اپنی ادبی زندگی بہ حیثیت شاعر شروع کی۔لہولہو کشمیر ۱۹۹۱ء میں منظر عام پر آنے والا پہلا مجموعہ تھا۔اس کے بعد انکشاف دوسرا شعری مجموعہ ۲۰۰۳ء میں شائع ہوا۔افتخار مغل نے زلزلہ ۲۰۰۵ء کا آنکھوں دیکھا حال ''بھونچال'' کی صورت میں قاری کو دیا۔علاوہ ازیں ''سوری رانگ نمبر'' کے نام سے سیکڑوں اخباری کالمز بھی آپ کے فن کا ثبوت ہیں۔افتخار مغل نے صحافت سے بھی وابستگی اختیار کی رکھی جب کہ کشمیر لٹریری سوسائٹی میں ادبی تنظیم کی بنیاد رکھ کر ادب کی ترقی و ترویج میں بھی کردار ادا کیا۔افتخار مغل نے اپنی عمر علم و ادب کی سرگرمیوں کے لیے وقف رکھی۔فشار خون اور ذیابیطس جیسے موذی امراض نے آپ کو گھیر لیا لیکن آپ نے کبھی کسی بیماری کو اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیا۔ادب کا افتخار بلا آخر ۱۰ اپریل ۲۰۱۱ء کو دل کا دورہ پڑنے کے باعث مظفر آباد میں راہی ملک عدم ہوا۔ان کی تدفین حکومتی سرپرستی میں آزاد کشمیر اسمبلی سے ملحقہ قبرستان چھتر دومیل میں کی گئی۔

فکری جائزہ:

افتخار مغل کی شاعری میں فکری رجحانات وہی ہیں جو آزاد کشمیر کے دیگر شعرا کے ہاں ملتے ہیں۔ان کے مسائل اور ان کی تمام تر فکر کا دائرہ ان کی اپنی دھرتی کے گرد گھومتی ہے۔کشمیر سے ان کی محبت مثالی تھی۔یہی وجہ ہے کہ وہ اس زمین کے درد کو شدت سے محسوس کرتے ہیں۔ان کا اولین مجموعہ ''لہولہو کشمیر'' مکمل طور پر ان کی اس فکر کا غماز ہے۔افتخار مغل کے اس مجموعے کے حوالے سے پروفیسر خان زمان مرزا لکھتے ہیں۔

''افتخار مغل نے ''لہولہو کشمیر'' میں وقت کی مناسبت سے وطن عزیز کی محبت کے تار کو چھیڑ کر احباب فکر و دانش کو احساس ذمہ داری دلانے کا انوکھا اور منفرد انداز اپنایا ہے۔''۱۶

افتخار مغل کی شاعری کا ایک بڑا حصہ کشمیر کے موضوع پر ہے۔ وہ اپنی شاعری میں کشمیر کو ایسے سموتے ہیں کہ یہ ان کی شاعری کا جزو لاینفک معلوم ہوتا ہے۔ ان کی شاعری کو دیکھ کر یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ ان کی رگوں میں کشمیر کی محبت لہو بن کر دوڑتی ہے جیسا کہ سیدہ آمنہ بہار رونا لکھتی ہیں:

''افتخار مغل کشمیر کے حساس ترین لکھاری ہیں جن کے رگ و ریشے میں وطن کی محبت رچی ہوئی ہے اور ان کا ہر شعر اس بات کی غمازی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ انھوں نے وادیٔ کشمیر کے جلتے مناظر خود سوختہ ہو کر دکھائے ہیں انھوں نے سری نگر میں کرفیو کی شدت اور جلتے گھروں کی حدت روح کی گہرائیوں تک محسوس کی ہے اور ان کی انگلیوں کی پوروں میں کرب کی یہ ساری آگ سمٹ آتی ہے۔''۱۷

افتخار مغل اس بات کی بھی امید رکھتے ہیں کہ دشمن کے دستِ جفا کش سے جلد یہ خطہ آزاد ہو کر رہے گا۔

چل پڑی جہلم کنارے پھر سے آزادی کی بات
جب کوئی لاشہ کنارے آ لگا بارش کے بعد

(افتخار مغل، انکشاف، ص ۲۰۶)

افتخار مغل اپنے جذبات کو کشمیر کے لیے ابھرنے سے کسی صورت نہیں روک سکتے۔ افتخار مغل کے ہاں علامات و استعارات بھی وطن عزیز سے ہی متعلق ہیں۔ افتخار مغل کی آواز آزادیٔ کشمیر کی منزل کی جانب بہت نمایاں نظر آتی ہے۔ وہ اس بات کے شدید خواہاں ہیں کہ ان کا وطن پنجۂ غیر سے آزادی حاصل کرے۔ ان کا یہ عمل فطرتی ہے۔ ان کے الفاظ میں آزادی کے دیپ اور ہم وطنوں کے درد ڈھونڈنا قطعی مشکل نہیں۔ ان کی کیفیت وطن کی محبت میں سرشاری سے شروع ہو کر محبت بھرے الفاظ پر ختم ہوتی ہے۔ افتخار مغل کے لہو میں جو کشمیر کی محبت رچی بسی ہوئی ہے وہ ان کے الفاظ کی صورت اور شعروں کے روپ میں ڈھل کر ان کے کلام کو تازگی بخشتی ہے۔

دو ہو کر بھی جدا جدا، ہیں کب میں اور کشمیر

ختجراب سے مادھوپور تک سب ، میں اور کشمیر

(افتخار مغل،انکشاف،ص۱۱۶)

نہیں اے قاتلو! دامن تمھیں دھونے نہیں دیں گے

ہم اپنے خون کی بے حرمتی ہونے نہیں دیں گے

(افتخار مغل،لہولہو کشمیر،ص ۳۷)

انا پرستی وخودار

افتخار مغل کے ہاں انا پرستی بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ وہ ایک ایسے قبیلے کے فرد ہیں جس کو اپنی میراث پر بڑا ناز ہے۔ تیمور کی اولاد ہونے پر افتخار مغل کو ہمیشہ فخر رہا۔ ان کے ہاں انا اس قدر موجود ہے کہ وہ اپنے سے کسی کو بھی اہم نہیں سمجھتے۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کا خاندان اور ان کی شخصیت کسی کے سامنے جھکنے والے نہیں س۔ احمد ندیم قاسمی، افتخار مغل کے اس وصف اور خودداری کے حوالے سے رقم طراز ہیں:۔

'' قدیم و جدید اردو اور فارسی غزلوں میں سے اگر بے مثال سراسر بے مثال اشعار کا انتخاب کیا جائے تو ان میں افتخار مغل کا یہ شعر، ہر صورت شامل رہے گا۔

یہ دیکھ کر مری حیرت کی انتہا نہ رہی

کہ میں نے ہاتھ بھی پھیلا دیا مرا بھی نہیں

جو شاعر خودداری اور غیرت مندی کے لازوال جذبے کا اظہار ایک شعر میں اس سلیقے سے کر سکتا ہو تو اعتراف کرنا پڑے گا کہ وہ معیاری شاعری تخلیق کرنے پر پوری قدرت رکھتا ہے۔'' ۱۸

احمد ندیم قاسمی یقیناً افتخار مغل کی شخصیت سے اور ان کی نفسیات سے بہ خوبی آگاہ تھے۔ انھوں نے جو یہ بات اخذ کی وہ بجا طور پر درست ہے۔ افتخار مغل کو جو لوگ جانتے ہیں وہ اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ افتخار مغل کی ذات میں بلا کی خودداری اور انا پرستی تھی۔ انھوں نے اپنے اس مزاج کی وجہ سے کبھی کسی کے آگے سرنگوں نہیں کیا۔ افتخار مغل کے کلام میں اس فکر کے حامل دیگر اشعار دیکھیں:

بہت ہو گا تو یہ کہ ہم محبت ہار جائیں گے
تمھیں بھی ظالمو ہم چین سے سونے نہیں دیں گے

(افتخار مغل،لہولہو کشمیر،ص ۳۷)

افتخار مغل اپنی انا کو کبھی کم نہیں ہونے دیتے۔ وہ اس حوصلے کے ساتھ زندہ ہیں کہ ظلم و بربریت ہو، جبر ہو، یا کوئی بھی مسائل ہوں ان کی انا ہمیشہ سلامت رہے گی۔

شہر تاراج ہے، جبر کا راج ہے
پھر بھی ثابت ہیں میری انا اور میں

(افتخار مغل،انکشاف،ص ۱۲۷)

افتخار مغل کی خودداری کا حامل یہ شعر دیکھیں جس میں وہ اس بات کا دعویٰ کر رہے ہیں کہ وہ کسی کے سہارے سے نہیں بل کہ اپنی لگن محنت اور کوشش سے ہی اپنی منزل تک پہنچے ہیں۔ وہ اس بات پر مطمئن ہیں کہ وہ کسی کے احسان کے بوجھ تلے نہیں آئے بل کہ اپنی ابتدا سے انتہا تک ہر قدم پر خودداری کا مظاہرہ کیا ہے۔

مری اٹھان کی ہر اینٹ میں نے رکھی ہے
میں خود بنا ہوا بنایا ہوا نہیں ہوں میں

(افتخار مغل،انکشاف،ص ۱۳۱)

وہ نہیں ملتا تو پھر اس کو خدا سے بھی نہ مانگ
عاشقی اپنی جگہ ہے اور انا اپنی جگہ

(افتخار مغل،انکشاف،ص ۱۷۹)

افتخار مغل اس بات کے قائل ہیں کہ اگر انا اور عزت کے لیے جسم بھی کٹ جائے تو کوئی ملال نہیں سر سلامت رہے اور عزت گنوا دی جائے تو ایسے سر کی سلامتی کوئی معنی نہیں رکھتی۔

گر آبرو ہی سلامت نہیں بہ مقتل زیست

تو پھر یہ کاسئہ سر کوئی کیوں بچا لے جائیں

(افتخار مغل، انکشاف، ص۱۹۰)

یہ کون ہے جو ہواؤں سے بھی نہیں ٹوٹا

یہ کون ہے مرے اندر پیمبروں جیسا!

(افتخار مغل، انکشاف، ص۲۱۷)

ہمیں تباہ تو ہونا تھا اپنی اپنی جگہ

طویل جنگ تھی اور جنگ بھی انا کی تھی

(افتخار مغل، انکشاف، ص۱۴۵)

عشق ومحبت:

عشق ومحبت اردو شاعری کا بنیادی موضوع ہے۔اردو کے سبھی شعرا نے اس موضوع پر قلم کا استعمال کیا۔آزاد کشمیر کے باسی بھی محبت کی مٹی سے بنے ہیں۔ یہاں کے شعرا کے ہاں محبت بہت اہم اور مرکزی موضوع ہے۔محبتوں کی سر زمیں میں بسنے والے شاعر افتخار مغل کے ہاں بھی محبت ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ایم یامین کے مطابق:

''وہ محبت بھرے لفظوں، اداس رنگوں کی لکیروں اور احساس کی آوازوں سے صداقتوں کو اجاگر کرتا ہے۔افتخار مغل احساس کی اس سطح پر ہے جہاں ہاتھوں کی بہ جائے دماغوں کو مسلح کیا جاتا ہے۔''۱۹

افتخار مغل کے ہاں وطن کی محبت کے ساتھ ساتھ عشق مجازی بھی بڑے واضح انداز میں ملتا ہے۔ان کا محبوب اسی سرزمین سے متعلق ہے وہ کوئی ماورائی نہیں ہے۔افتخار مغل اس سے ملنے کے خواہاں ہیں۔وہ وصل کے لمحات کو محبت کے قیمتی پل سمجھتے ہیں تاہم افتخار مغل کے نزدیک صرف وصل کا نام ہی محبت نہیں بل کہ ہجر کا احساس اور کرب بھی محبت میں لازم ہے۔

افتخار مغل محبت کا لاگ الاپتے دکھائی دیتے ہیں ان کے ہاں محبت کی اہمیت کیا ہے اس کا اندازہ ان کے زیرِ طبع مجموعے کے نام ''محبت'' سے بھی بہ خوبی لگایا جا سکتا ہے۔افتخار مغل نے اپنے تیسرے مجموعے کا نام محبت اپنی زندگی میں ہی تجویز کیا اور وصیت کی کہ میرے آئندہ مجموعے کا نام ''محبت'' رکھا جائے۔ان کی محبت کا صلہ روایتی اردو شاعری کی طرح بے

وفائی ہی ملا ہے۔لیکن وہ اس بات کو مانتے ہیں کہ جب کسی کو ٹوٹ کر چاہا جائے تو اس پر پھر دکھ بھی زیادہ اٹھانا پڑتا ہے۔

بلا کا رنج تو ہونا تھا افتخار مغل
کہ بے وفا سے محبت بھی تو بلا کی تھی

(افتخار مغل،انکشاف،ص۱۲۵)

خوش دلی اور ہے اور عشق کا آزار کچھ اور
پیار ہو جائے تو اقرار نہیں ہوتا یار

(افتخار مغل،انکشاف،ص۱۳۷)

بس ایک جہت تھی، محبت کی اک جہت ورنہ
عرض نہیں تھی ہمیں ہشت سو کے ہونے سے

(افتخار مغل،انکشاف،ص۱۴۳)

افتخار مغل اس انسان کا جینا بے کار سمجھتے ہیں کہ جس انسان کو محبت نہیں۔ان کے مطابق سر میں عشق کا سودا نہ ہو تو سر کسی بوجھ سے کم نہیں اور اس بوجھ کو اٹھا کر پھرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

تو سر کا بوجھ بھلا کس لیے اٹھا کے پھرے
وہ جس کے سر میں خدا عشق کی ہوا نہ رکھے

(افتخار مغل،انکشاف،ص۱۴۸)

افتخار مغل محبت کے یوں قائل ہیں کہ جیسے ان کو محبت کے علاوہ کوئی کام کرنا آتا ہی نہیں۔افتخار مغل کے ہاں بھی کیفیت کچھ ایسی ہی ہے وہ اپنے لیے محبت ہی کو اہم جانتے ہیں لیکن وہ خوف زدہ ہیں کہ اگر محبت سے بھی جی بھر گیا تو کیا کروں گا۔

مجھے بس ایک ہنر آیا محبت!
محبت سے بھی گر دل بھر گیا تو؟

(افتخار مغل،انکشاف،ص۱۵۱)

افتخار مغل کے ہاں عشق و محبت کے حامل یہ اشعار دیکھیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ افتخار مغل کے ہاں محبت کی کیا

اہمیت ہے۔

مجھے بھی ٹک اپنی دعا دیجو میؔرصاحب جی!
مرے بھی سر میں ہوا عشق و آشنائی کی ہے

(افتخاؔر مغل،انکشاف،ص۱۵۵)

میں محبت ہوں، محبت کا اثر ہوں اے دوست
یہ تو ممکن ہی نہیں ہے کہ میں زائل ہو جاؤں

(افتخاؔر مغل،انکشاف،ص۱۶۳)

شانت رکھتا ہے دل وجان کو محبت کا سرور
عشق انسان کو بوجھل نہیں ہونے دیتا

(افتخاؔر مغل،انکشاف،ص۱۷۴)

خزینہ لہجہ اور میؔر سے عقیدت:

افتخاؔر مغل کے ہاں محبت میں ناکامی اوراس پر مایوسی کی بھی گہری چھاپ دکھائی دیتی ہے۔ان کے محبوب کی بے وفائی نے ان کے اندر مایوسی بھر دی ہے۔جب کہ دوسری طرف وطن کی اور ہم وطنوں کی تکالیف کو بھی برداشت کرنا افتخاؔر مغل کے لیے چنداں آسان نہیں۔افتخاؔر مغل اپنی ذات میں ایک لاش بن گئے اوراس کی وجہ ان کے محبوب کا ہجراورمحبت میں ناکامی ہے۔افتخاؔر مغل موت کے لیے بے چین ہیں تو کہیں وہ اپنی قبر میں خود پڑے ہیں۔ان کے دل ودماغ کسی بھی خوشی سے بالکل بے چہرہ ہیں۔ان کی زندگی مکمل شکست ہےاور یہ سب محبت کا شاخسانہ ہے۔

اک مسلسل شکستگی ہے حیات
زیست اک ٹوٹتا ستارہ ہے

(افتخاؔر مغل،انکشاف،ص۱۳۴)

افتخاؔر مغل اپنی زندگی سے یوں بے زار ہیں کہ ان کوزندگی بوجھ معلوم ہوتی ہے۔وہ اپنے محبوب سے جدا ہوکر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتے وہ اس کو اپنی وفا کی دلیل بھی مانتے ہیں کہ محبوب کی جدائی میں تنہا جینا دھوکے اور بے وفائی کے مترادف

ہے۔

یار! یہ ہجر کا غم اس سے تو موت اچھی ہے
جاں سے یوں ہی کوئی بے زار نہیں ہوتا یار

(افتخار مغل،انکشاف،ص۱۳۶)

افتخار مغل کا محبوب ان کے لیے مسائل کھڑے کرتا رہتا ہے ان کا کوئی مسئلہ کبھی حل نہیں ہونے پایا۔افتخار مغل اپنے ان مسائل کی وجہ اپنے محبوب کا شوق بتاتے ہیں ان کے مطابق ان کا محبوب الجھی رہو چیزوں کو محبوب رکھتا ہے اوراس کا یہی شوق افتخار مغل کے مسائل کو بھی حل نہیں ہونے دیتا۔

اس کو الجھی ہوئی چیزوں سے بہت رغبت ہے
وہ مرے مسئلوں کو حل نہیں ہونے دیتا

(افتخار مغل،انکشاف،ص۱۷۵)

افتخار مغل معتقد میر تھے ہم یہ وجہ بھی ہے کہ ان کے ہاں میر کا حزینہ لہجہ موجود ہے۔ان کے شعروں میں جا بہ جا اس بات کا اعراف بھی ملتا ہے وہ میر کی زندگی کے درد سے بہت متاثر معلوم ہوتے ہیں۔میر سے عقیدت کا ایک بین ثبوت یہ بھی ہے کہ افتخار مغل نے اپنی وفات سے ۱۳سال قبل ۷انومبر ۱۹۹۸ءایک روز دیوان میر کے مطالعے کے بعد ایک شعر پر نوٹ لکھااور اپنے خالہ زاد اعجاز نعمانی سے کہا کہ میر کا یہ شعر میری قبر پر کتبہ کیا جائے۔

ہم بے خود ان تصویر اب گئے
آئندہ ہم سے آپ میں آیا نہ جائے گئے

(میر تقی میر،کلیات میر،ص۱۸۱)

میری قبر کے کتبے پر کندہ کیا جائے۔علاوہ ازیں افتخار مغل کا کلام بھی ان کی میر سے عقیدت کا ظاہر کرتا ہے۔بل کہ میر کا قنوطی انداز افتخار مغل کو بہت بھایا ہے۔

کچھ رونا رلانا مری تہذیب بھی ہے یار

کچھ میؔر سا جینا مجھے بھایا بھی بہت ہے

(افتخاؔرمغل،انکشاف،ص۱۸۱)

میں نے اس غم کو چھوا اس کی تلاوت کی ہے
محض شعروں میں غم میؔر نہیں دیکھا ہے

(افتخاؔرمغل،انکشاف،ص۱۹۳)

اک وہ تھے کہ جو میؔر بے عشق کے صدقے
اک ہم کہ خجل، عشق کا آزار لگا کر

(افتخاؔرمغل،انکشاف،ص۱۶۰)

احمد ندیم قاسمی افتخاؔرمغل کی میؔر سے اس قدر عقیدت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''افتخاؔرمغل کے ہاں میرتقی میؔر سے عقیدت اور محبت کا وجود دیدنی ہے۔میؔر کا مرکزی موضوع محبت ہےاور افتخاؔرمغل کی غزل بھی اس محور پر رواں ہے۔میؔر سلاست اظہار کے معجزے دکھاتا چلا جاتا ہے اور افتخاؔرمغل نے سلاست کا یہ حسن میؔر سے ہی حاصل کیا ہے۔''[20]

افتخاؔرمغل کے ہاں قنوطی لہجہ میؔر ہی کا مرہون منت ہے انھوں نے میؔر سے اس قدر اثر لیا کہ ان کے کلام میں حزینہ اور قنوطی انداز ان کا خاص موضوع بن کر سامنے آ گیا۔افتخاؔرمغل نے جس قدر درد کو بیان کیا وہ ان کی شاعری میں ایک منفرد انداز بن گیا۔اس فکر کے حامل افتخاؔرمغل کے مزید اشعار دیکھیں۔

نا گفتہ ہی بھلی تھی مری داستان درد
ایسی تھی دل خراش کہانی مری کہ بس

(افتخاؔرمغل،انکشاف،ص۲۲۷)

عشق کے غم سے عقیدت ہو جیسے وہ افتخاؔر

میؔر کے مرقد پہ جا کر فاتحہ خوانی کرے

(افتخاؔر مغل، انکشاف، ص۲۳۲)

جو سوگوار ہو میری طرح اسے ہر شخص

ہزار خوش ہو مگر سوگوار لگتا ہے

(افتخاؔر مغل، انکشاف، ص۲۳۴)

معاشرت کی عکاس:

ہر شاعر جس معاشرے میں رہتا ہے اس معاشرے کا اثر غیر شعوری طور پر قبول کرتا ہے۔ میؔر نے اپنے معاشرے کی عکاسی کی غالبؔ نے اپنے دور اور معاشرت کو اجاگر کیا، اقباؔل نے اپنے دور اور معاشرت کو اپنی فکر اور شاعری کا حصہ بنایا۔ افتخاؔر مغل، میؔر، غالبؔ اور اقباؔل کے معتقد ہونے کے علاوہ معاشرے کے بہترین عکاس بھی تھے۔ انھوں نے اپنے گہرے مشاہدے کی بدولت معاشرے کے ان پہلوؤں کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا جو کہ عام آدمی کے ساتھ وابستہ ہیں۔ افتخاؔر مغل نے معاشرت کو جس انداز سے بیان کیا وہ انداز نیا تو نہیں البتہ الگ ضرور ہے۔ افتخاؔر مغل کی شاعری میں ہر اس شخص کی بات کی گئی ہے جو اس معاشرے کا حصہ ہے۔

لگتا ہے آپ گاؤں سے آئے ہیں افتخاؔر

شہروں میں تو خلوص کی قلت نہ پوچھے

(افتخاؔر مغل، انکشاف، ص۲۴۴)

ہماری بستیوں کے لوگ ہونے ہیں تو حیرت کیوں

یہاں تو پورے قد کا آدمی خویہ ٹھہرتا ہے

(افتخاؔر مغل، انکشاف، ص۲۳۷)

اینٹ گارے سے تو زندان بھی بن جاتے ہیں

گھر سمجھ لیتے ہو رگوں و درودیوار کو تم

(افتخار مغل، انکشاف، ص۲۲۳)

تاریخی شعور:

افتخار مغل کی غزل میں تاریخی شعور بھی جا بہ جا نظر آتا ہے۔ جہاں افتخار مغل عشق کے اساطیر پر خامہ فرسائی کرتے ہیں وہیں وہ لوگ جنھوں نے بنی نوع انسان کو کچھ دیا ہے۔ ان کے اشعار میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ افتخار مغل وسیع المطالعہ شخصیت تھے ان کی تاریخ پر گہری نظر تھا۔ اپنی تاریخ کو وہ کسی طور فراموش نہیں کر سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کلام میں ان کا تاریخی شعور کھل کر سامنے آتا ہے۔ شعر دیکھیں:

کشب رشی سے لالک جان تک شجرہ یاد ہے سارا

کب بھولے ہیں اپنا نام نسب، میں اور کشمیر

(افتخار مغل، انکشاف، ص۱۱۶)

ہمیں جلانا ہے قیس و کوہ کن سے چراغ

ہمیں وفا کے اساطیر تک پہنچنا ہے

(افتخار مغل، انکشاف، ص۲۵۲)

افتخار مغل کے تاریخی شعور میں محبت کے انصاف کے اور مذہب کے تمام پہلو موجود ہیں۔

مری اس نسل نے دیکھے ہیں جہاں گیر کئی

پر کہیں عدل جہاں گیر نہیں دیکھا ہے

(افتخار مغل، انکشاف، ص۱۹۳)

کچھ رونا رولانا میری تہذیب بھی ہے

کچھ میر سا جینا مجھے بھی بھایا بھی بہت ہے

(افتخار مغل، انکشاف، ص۱۸۱)

فنی جائزہ:

افتخار مغل اپنی فکر کے ساتھ ساتھ فنی اعتبار سے بھی بہت مضبوط شاعر واقع ہوئے ہیں۔ تمام تر فنی لوازمات ان کی شاعری کا خاصا ہیں نادر تشبہات و استعارات کے علاوہ صنعتوں کا استعمال اور تراکیب سازی ان کے کلام کی خصوصیات ہیں۔ افتخار مغل کا فن پختگی کے اوج پر دکھائی دیتا ہے جس کی اہم وجہ ان کی فن پر دسترس ہے۔ ان کی چابک دستی ہیں ان کے کلام کو فنی اعتبار سے کسی بھی بڑے شاعر کے مدمقابل کھڑا کرتا ہے۔ آزاد کشمیر کے شعرا کے ہاں بلاشبہ افتخار مغل ہی ایسے شاعر ہیں جن کے ہاں ایسے کئی اشعار ہیں جو زندہ و جاوید ہونے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ افتخار مغل کی فنی خصوصیات کے حوالے سے احمد وقار قم طراز ہیں۔

> ''افتخار مغل استعارات ، نادر تشبیہات و تراکیب کے حوالے سے بھی بہت ثروت مند ہے۔۔۔ افتخار جو تشبیہ لاتا ہے وہ خاتم مصرع میں نگینے کی طرح بیٹھ جاتی ہے اور تشبیہ شعر کی شعریت اور معنویت کو چار چاند لگا دیتی ہے۔''۲۱

تشبیہات و استعارات:

افتخار مغل کے کلام کو فنی اعتبار سے دیکھا جائے تو ان کے ہاں تشبیہات و استعارات کا استعمال بہت ہی عمدہ طریقے سے کیا گیا ہے۔ اگر تشبیہ و استعارے کا برملا استعمال کیا جائے تو یہ چیز کلام میں نفاست اور ندرت پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ قاری کے لیے خوش کن تاثیر رکھتی ہے۔ شاعر کو اگر اس فن میں ملکہ حاصل ہو تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ شاعر فنی اعتبار سے ثروت مند ہے۔ مولانا حالی نے بھی تشبیہات کو کلام کی جان قرار دیا ہے۔ افتخار مغل کے ہاں تشبیہات کی اگر بات کی جائے تو کئی تشبیہات بالکل نئے انداز میں ملیں گی مثال کے طور پر:

کبھی لگتا ہے کہ تم سرو سمن جیسے ہو
کبھی لگتا ہے کہ ہیں سرو سمن تم جیسے

(افتخار مغل، انکشاف، ص۱۴۵)

شفق مثال چمکتا ہے تیری چھت کا افق

یہیں کہیں تھا ابھی تیرے حسن کا سورج

(افتخار مغل، انکشاف، ص۱۵۲)

تشبیہات کے اعتبار سے افتخار مغل کی شاعرانہ چابک دستی ان کے کلام میں ایک سے بڑھ کر ایک مثال کے روپ میں ملتی ہے۔

ہمارا لہجہ تھا جبریل کے پروں جیسا
مگر تمھارا رویہ، ستم گروں جیسا

(افتخار مغل، انکشاف، ص۲۱۷)

ہم نے اس چہرے کو باندھا نہیں مہتاب مثال
ہم نے مہتاب کو تجھ رخ کے مماثل باندھا

(افتخار مغل، انکشاف، ص۲۲۶)

تشبیہ کے ساتھ ساتھ افتخار مغل نے استعارات کو بھی بڑی نفاست سے استعمال میں لایا ہے۔ ان کی تشبیہات کی طرح ان کے استعارات بھی انوکھے اور جدید ہیں۔ افتخار مغل کے کلام سے استعارات کے حامل یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

آنکھ کی جھیل میں نہ چمکا جو
وہ ستارہ بھی کیا ستارہ ہے

(افتخار مغل، انکشاف، ص۱۳۵)

ابھی ٹوٹا تھا اک ستارۂ اشک
پھر مژگاں پر نیا ستارہ ہے

(افتخار مغل، انکشاف، ص۱۳۵)

تراکیب سازی:

افتخار مغل نے اپنے کلام میں خاص تراکیب کا استعمال کیا ہے۔ تراکیب سازی میں بھی افتخار مغل نے اپنے فن کا مجروح نہیں ہونے دیا۔ ان کا کلام نادر اور جدید تراکیب کے ساتھ ساتھ بھی بنی بنائی تراکیب سے بھی مزین ہے۔ افتخار مغل

نے تراکیب سازی میں یوں اپنے جوہر دکھاتے ہیں کہ قاری داد دیے بنا نہیں رہ سکتا۔افتخار مغل کی تراکیب دیکھیں:۔

اٹھ سر کی فصلیں کٹانے چلیں ہم
اٹھو جذب عشق آزمانے چلیں ہم

(افتخار مغل،،لہولہو کشمیر،ص۲۱)

ررد رو، تنگی حالات زمانہ کے قتیل
چہرے تابندہ مگر دل میں سلگتے ارماں

(افتخار مغل،،لہولہو کشمیر،ص۴۵)

افتخار مغل کے ہاں تراکیب کا اس قدر عمدہ استعمال ہے اور ایسی نایاب تراکیب ہیں کہ اردو شاعری میں مثال ڈھونڈنا مشکل نظر آتا ہے۔افتخار مغل کی چند تراکیب دیکھیں مثلاً برگِ غزل،شبِ داد، بدن کا ڈھلنا، دوسرا پہر،شام کی سیڑھی ،شعلۂ رخسار،خس کو چہ قاتل، بیاضِ زخم،عروس زبان قصہ گری ،جبس نظم و رباعی ، قمار خانہ و جاں، بستہ صدرنگ، کنجِ یار، عنقائے مضمون،نوکِ نشتر ،پنجۂ جبر،دستِ قاتل وغیرہ یہ تمام ایسی تراکیب ہیں جو افتخار مغل کے کلام میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ افتخار مغل کے کلام سے تراکیب کے حامل یہ اشعار دیکھیں۔

ایسے انداز سے حالات نے بدلا پہلو
چھن گئی رات کی رانی سے متاعِ خوش بو

(افتخار مغل،،لہولہو کشمیر،ص۴۳)

ہم میں قوت ہے بچھڑ جانے کی ہم ہجر نصیب
چھوڑ آئے ہیں کئی لعل و یمن تم جیسے

(افتخار مغل،انکشاف،ص۱۴۵)

میں ابنِ ارض ہوں میرا نسب مری مٹی

جو خاک زاد نہیں مجھ سے سلسلہ نہ رکھے

(افتخار مغل، انکشاف، ص۱۴۹)

صنعتوں کا استعمال:

کسی بھی شاعر کے فن میں بہت ضروری اور اہم ہوتا ہے کہ وہ صنائع بدائع کے استعمال پر دسترس رکھتا ہوں۔ اردو کے اکثر شعرا کے ہاں صنائع بدائع کمزور نظر آتے ہیں بالخصوص عہد حاضر میں بہت کم شعرا ایسے ہیں جن کے کلام میں صنعتوں کا استعمال ہر محل اور خوب صورت کیا گیا ہو۔ آزاد کشمیر کے اکثر شعرا کے ہاں بھی جو کمی نظر آتی ہے وہ افتخار مغل کے ہاں ندارد ہے۔ افتخار مغل کی غزل میں ان کے استاد ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ چوں کہ افتخار مغل کو اردو زبان پر بھی عبور حاصل تھا اس لیے بھی انھوں نے اپنے کلام میں بہت احتیاط برتی ہے۔ صنعتوں کے استعمال میں افتخار مغل دیگر شعرائے آزاد سے کچھ اوپر نظر آتے ہیں۔

صنعت تضاد:

صنعت تضاد کا استعمال بلا شبہ ہر ایک شاعر کے ہاں کیا گیا ہے۔ یہ نسبتاً آسان صنعت ہے۔ جس میں ایک لفظ کی ضد سے دوسرا لفظ مصرعے یا شعر میں آتا ہے۔ افتخار مغل کے ہاں صنعتِ تضاد کے حامل اشعار کی کوئی کمی نہیں۔ مگر وہ جس طرح تضاد کا استعمال کرتے ہیں وہ بھی خاصے کی چیز ہے۔

لوگ بھی سو گئے ، روگ بھی سو گئے
جاگتے ہیں مرا رَت جگا اور میں

(افتخار مغل، انکشاف، ص۱۲۶)

سونے کی ضد میں جاگنے کا استعمال کیا گیا ہے۔ افتخار مغل کے ہاں تضاد کے حوالے سے صرف یہ کہنا کہ انھوں نے لفظی تضاد کو ملحوظ رکھا ہے غلط ہو گا۔ تضاد کے استعمال کے ساتھ انھوں نے شعری تازگی اور انفرادیت کو بھی قائم رکھا ہے۔ افتخار مغل کے ہاں کہیں بھی معنوی ہم آہنگی یا وحدت تاثر کی کیفیت کم ہوتی دکھائی نہیں دیتی، افتخار مغل کا یہ فن ان کی شخصیت سے مشتق ہے شعر دیکھیں:

اب ایک بار باہم ہو کے بھی رزا دیکھیں

کہ ایک ایک میں بٹ کر تو ہم نے دیکھ لیا

(افتخار مغل، انکشاف، ص۱۸۸)

یزیدیت کی مہیب شب میں حسینیت کے دیے جلیں گے

تمام تر مصلحت کے باوصف بھی ہمارا یہ فیصلہ ہے

(افتخار مغل، لہولہو کشمیر، ص۱۸)

صنعت تجنیس مضارع:

صنعت تجنیس کا مطلب اردو شاعری میں ایک ہی طرح کے الفاظ یوں استعمال کرنا کہ ان کے معنی مختلف ہوں۔ ڈاکٹر سلیم اختر کے بہ قول:

''ایک ہی لفظ کو مختلف معنی میں استعمال کرنا اس صورت میں کہ لفظ کا املا برقرار رہتا ہے۔ لیکن معنی تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔تجنیس جنس سے حاصل کیا گیا ہے۔یعنی ایک جنس کے الفاظ کا استعمال جیسے مار (سانپ) مار (فعل) پلنگ / پلنگ (چیتا) نشان/ نشان (علم) سخن / سخن (شاعری)''۲۲

تجنیس ہی قسم تجنیس مضارع بھی اردو شاعری میں بہت استعمال ہوتی ہے۔تجنیس چوں کہ ایک مشکل فن ہے اس لیے یہ بہت کم شعرا کے ہاں ملتا ہے۔افتخار مغل کے ہاں تجنیس کی مثال تو عنقا ہے تاہم تجنیسِ مضارع کی مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں۔

جمال گاہِ تغزل کی تاب و تب تری یاد

تنگ نائے غزل میں سماتے کب تیری یاد

(افتخار مغل، انکشاف، ص۱۲۰)

درجہ بالا شعر میں تب اور کب میں تجنیس مضارع موجود ہے۔ت اور خ کا یک حرفی فرق دیکھا جاسکتا ہے۔

میں قد سے فروتر کس در سے نہیں گزرا

صد شکر کہ پانی ابھی سر سے نہیں گزرا

(افتخار مغل، انکشاف، ص۲۴۲)

لوگ بھی سو گئے روگ بھی سو گئے
جاگتے ہیں مرا رَت جگا اور میں

(افتخار مغل، انکشاف، ص۱۲۶)

دل کو چنیا میں جو رہنا پڑ جاتے
جو سہنا ہو وہ سہنا پڑ جائے

(افتخار مغل، انکشاف، ص۲۰۷)

درجہ بالا اشعار میں دراور سراور رہنا اور سہنا صنعت مضارع کی مثالیں ہیں۔

صنعت تکرار:

اردو شعرا کے ہاں تکرار لفظی سے بھی شعری حسن کو دوبالا کرنے کی کامیاب سعی کی گئی ہے۔اس روایت کو افتخار مغل نے بھی بہ خوبی نبھایا ہے۔افتخار مغل کے ہاں صنعت تکرار لفظی کے اشعار کی تعداد گو کم ہے تاہم جو اشعار موجود ہیں ان میں افتخار مغل کا فن اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔انھوں نے بہت نفاست سے تکرار لفظی سے کام لیا ہے۔مثال دیکھیں:

وہ اجر تھا حاصل ہوا، ہوا نہ ہوا
میں اس کا وقت تھا سو وہ مجھے گزار گیا

(افتخار مغل، انکشاف، ص۱۹۷)

صنعت ترافق:

صنعت ترافق نسبتاً ایک مستقل صنعت ہے اور شعرا کے ہاں ایسے اشعار شاذ شاذ مل ہی جاتے ہیں جن میں ترافق نظر آئے۔ترافق سے مراد کسی بھی شعر کے مصرع اولی اور مصرع ثانی کی ترتیب بدل دینے کے باوجود شعر بامعنی رہتا ہے اور اکثر اوقات اس نے معنی و مفہوم کسی قسم کی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔افتخار مغل کے ہاں ایسے اشعار وافر مقدار میں پائے جاتے ہیں جن میں صنعتِ ترافق کا خوب صورت استعمال ملتا ہے۔

کبھی لگتا ہے کہ تم سرو سخن جیسے ہو
کبھی لگتا ہے کہ ہیں سروسمن تم جیسے

(افتخار مغل، انکشاف، ص۱۴۵)

ترے خیال کی لو تو نہیں لرزنے دی
ہمار شعلے کیا کیا ذکر وہ رہا کہ بجھا

(افتخار مغل، انکشاف، ص۱۴۷)

یہ میرا جرم بھی ہے اور میرا فخر بھی ہے
دیے کو میں نے کبھی بھی نہیں کہا سورج

(افتخار مغل، انکشاف، ص۱۵۳)

اب درجہ بالا اشعار کو اگر ترتیب الٹ کر بھی پڑھیں تو وہ بامعنی ہی رہیں گے۔

سہل ممتنع:

سہل ممتنع اردو شاعری میں بہت اہمیت رکھتی ہے۔اس فن میں کسی بھی شعر کو موزونیت سے اگر مزید آسان کر دیا جائے تو نثر ہی بن سکتی ہے۔افتخار مغل نے میر کی جہاں دیگر خصوصیات میں تقلید کی وہاں میر کی ایک خوبی سہل ممتنع سے بھی مستفید ہوئے۔افتخار مغل کے ہاں سہل ممتنع کے حوالے اس احمد وقار رقم طراز ہیں:

''شعر کا بہ ظاہر آسان ترین اور فی الحقیقت مشکل ترین فن سہل ممتنع ہے۔افتخار اس فن میں بھی کامیاب اور کامگار نظر آتا ہے۔''۲۳

سہل ممتنع کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہ ایک ہی وقت میں شعر بھی ہوتا ہے اور نثر بھی یعنی اگر اس کو نثر کے انداز میں بھی پڑھیں تو حظ ضرور بخشتا ہے۔اور اگر موزوں کر کے پڑھیں تو بھی شعر کی خوب صورتی ماند نہیں پڑتی۔افتخار مغل کے ہاں سہل ممتنع کے حوالے بھی بے مثال شعری سرمایہ موجود ہے۔ان کے کلام سے یہ خوب صورت مثال دیکھیں:

میں پورا ہو گیا تو یاد آیا

مرا قصہ ادھورا رہ گیا ہے

(افتخار مغل، انکشاف،ص)

کہہ رہے ہو تو سچ سمجھ لوں گا
سچ، اگر سچ کہو، نہیں کہتے

(افتخار مغل، انکشاف،ص)

تمثال نگاری:

شعری فنون میں تمثال بھی عمدہ فن ہے۔ اکثر شعرا کے ہاں تمثال بہت خوبی سے استعمال کی گئی ہے۔تمثال شاعری کا ایک مکمل عنصر سمجھا جاتا ہے۔ ناقدین ادب کے نزدیک تمثال شاعری کے لیے صرف زینت اور سطحی آرائش ہے لیکن رومانوی تحریک کے نزدیک تمثال شاعری کی جان ہے۔محمد ہادی حسین کے مطابق:

> ''سادہ ترین الفاظ میں شاعرانہ تمثال کی توصیف یوں کی جا سکتی ہے کہ وہ الفاظ کے نقش ونگار سے بنی ہوئی ایک تصویر ہوتی ہے۔ کسی اسم صنعت سے، کسی تشبیہ سے، کسی استعارے سے ایک تمثال پیدا ہو سکتی ہے بل کہ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ کسی ایسی ترکیب، جملے یا عبارت کی صورت میں پیش کی جائے جو سطحی طور پر محض ایک مجموعہ الفاظ ہو۔۔۔ ہر شاعرانہ تمثال کسی نہ کسی حد تک استعارے کی خصوصیت رکھتی ہے۔''۲۴

افتخار مغل کا تخیل چوں کہ بہت مضبوط تھا وہ ایک وسیع النظر انسان اور شاعر تھے اس لیے انھوں نے لفظی تصویر کشی سے اپنی شعر کو زینت بخشی ہے۔ وہ چیزوں کو اصل رنگ و روپ کے ساتھ بہترین تخیل کے سانچے میں ڈھال کر یوں پیش کرتے ہیں کہ ان میں مکمل جسم بن کر سامنے آجاتا ہے۔

ذرا فراغ کے موسم کھلے تو بات کھلے
گھٹائیں گیسو سکھا لیں تو اس کی باتیں ہوں

(افتخار مغل، انکشاف،ص۱۱۹)

ایک خلد ایک اور انتہا اور میں

کتنے تنہا ہیں میرا خدا اور میں

(افتخار مغل،انکشاف،ص۱۲۶)

افتخار مغل نے درج بالا اشعار میں کس خوب صورتی سے لفظی تصویر کشی کی ہے ان کے ہاں پر تمثال کا حامل یہ شعر دیکھیں:

ایک خوش چشم ایسا بھی ہے شہر میں، جس کی آنکھوں میں جو کوئی دیکھے

اسے یوں لگے جیسے تحریر سرمہ کہے، میری پلکوں تلے سو رہو اجنبی

(افتخار مغل،انکشاف،ص۲۳۵)

شوخی وظرافت:

شوخی کا انداز بھی فن شعر میں اہمیت رکھتا ہے۔ ذوقِ سلیم جب شاعر پر حسن کو بے نقاب کرتا ہے تو شاعر کے لہو میں پھوٹنے والی پھلجڑ یاں اسے شوخ مضمون شعر میں باندھنے پر مائل کرتی ہیں یہ شوخی کہیں اپنے دائرے سے نکل کر ظرافت کی طرف بڑھتی ہوئی محسوس ہوتی ہے لیکن اس حد تک بھی نہیں کہ اسے شوخی کی بہ جائے ظرافت کہہ دیا جائے۔ ہاں ایسا ضرور ہے کہ اس شوخی میں کچھ ایسے عناصر ضرور ہوتے ہیں جو ظرافت کی طرف لپکتے اور ہمکتے ہیں۔ افتخار مغل کا مزاج شوخی وظرافت کا امتزاج تھا لیکن شعر میں ظرافت کی نسبت شوخی کی طرف ان کا میلان زیادہ ہے۔ اس شوخی میں بھی ظرافت کے جگنو چمکتے دکھائی دیتے ہیں۔ افتخار کے کلام میں ایسی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ مثال کے طور پر یہ شعر دیکھیں:

اب کیا کہوں اس شعر کی قیمت جسے سن کر

اک شعر سی لڑکی نے کہا پھر سے عطا ہو

(افتخار مغل،انکشاف،ص۲۵۵)

حسن تو ہو گا مگر ہم ہی نہ ہوں گے دوستو

ایک دن آنکھیں ترسنی ہیں ترسنے کے لیے

(افتخار مغل،انکشاف،ص۲۴۰)

درجہ بالا اشعار میں افتخار مغل نے شوخی اور ظرافت کے ساتھ اپنے جذبات کو عمدگی سے شعر کے قلب میں ڈھالا

ہے۔شعر میں لڑکی،آنکھوں کا ترسنے کے لیے ترسنا،شوخی بھی اور کسی حد تک ظرافت بھی رکھتے ہیں مزید شعر دیکھیں۔

دل فروشوں کے سامنے مت آ

یہ بدن کی بھری دکان لے کر

(افتخار مغل،انکشاف،ص۱۸۳)

افتخار مغل کے کلام میں یہ شوخی تاثیر کی بجلیاں بھر رہی ہے ان کے کلام میں یہ خوبی ایک جوہر کی مانند دکھائی دیتی ہے یہاں بیان کی برجستگی اور سلاست روی کے ساتھ ساتھ ان کا بھرپور شوخیانہ انداز بھی واضح نظر آتا ہے۔

بحور کا استعمال:

شعر مخصوص بحور میں کہے جاتے ہیں ان بحور کی تفصیل میں جانا ہمارے موضوع سے خارج ہے۔افتخار مغل کے فن کے تناظر میں یہاں صرف چھوٹی یا بڑی بحور کے تناظر میں بات کی جائے گی۔افتخار مغل کے ہاں چھوٹی اور لمبی بحر میں خوب صورت اشعار کہے ہیں۔ان کے ہاں بحروں کے استعمال کے حوالے سے احمد وقار لکھتے ہیں۔

''افتخار مغل چھوٹی بحر میں خوب شعر کہتا ہے۔۔۔چھوٹی بحر کے ساتھ ساتھ افتخار مغل طویل بحر میں بھی شعر کہنے کے فن سے خوب واقف ہے۔طویل بحر میں افتخار کی غزل کی تفہیم کے لیے قاری کوشش نہیں کرتا بل کہ از خود برگِ تخیل میں خود جذب ہو جاتی ہے جیسے اقبال کے بہ قول شاخِ گل میں بادِ سحر گاہی کا نم۔۔۔یہ غزل خود اپنے آپ کو قاری پر منکشف کرتی ہے اور یوں غزل کا ریشمی تھان قاری کے ہاتھ پر کھلتا چلا جاتا ہے۔قاری کو اس طویل ''بحر'' کی سکون آور موجیں ایک رو میں بہاتی چلی جاتی ہیں:''۲۵

افتخار مغل کے ہاں چھوٹی اور طویل بحروں میں جس سلیقے سے اشعار نکالے گئے ہیں وہ خود قابلِ داد ہیں۔افتخار مغل،میر سے جہاں دیگر فنون میں مستفید ہوئے وہیں بحروں کے استعمال کے حوالے سے بھی وہ میر کو اپنا استاد مانتے ہیں افتخار مغل کے کلام میں چھوٹی بحر کے حامل اشعار دیکھیں جن سے یہ خوبی اندازہ ہوتا ہے کہ بحور کے استعمال میں ان کی چابک دستی کس قدر تھی!

جس کے پاؤں تلے انیں ہی نہ ہو

کیا کر سر پہ آسمان لے کر

(افتخار مغل، انکشاف، ص ۱۸۲)

محبت اب کہاں؟ ان موسموں میں!

محبت استعارہ رہ گیا ہے

(افتخار مغل، انکشاف، ص ۱۹۵)

آنکھ میں باقی ہو گر بینائی

ایک مٹی کا دیا کافی ہے

(افتخار مغل، انکشاف، ص ۲۵)

چھوٹی بحور کے علاوہ طویل بحر کے حامل افتخار مغل کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

میں تم بھی سکتا ہوں یہ کھیل اپنے ہونے کا

یہ کھیل جس سے مرا دل ابھی بھرا بھی نہیں

(افتخار مغل، انکشاف، ص ۱۹۴)

ہاں! مسافت کی اک شام یوں بھی ڈھلی پیڑ کے ایک ڈھلتے ہوئے سائے نے

راستہ کاٹ کر میرا، مجھ سے کہا ''آج کی شام مجھ میں ہو اجنبی''

(افتخار مغل، انکشاف، ص ۲۳۵)

زیست اک دھند تھی، جو چھٹ گئی اس کی دھن میں

بڑھ گئی عمر، نظر گھٹ گئی اس کی دھن میں

(افتخار مغل، انکشاف، ص ۲۰۱)

صنعت مراعات النظیر :

اردو شاعری کی ایک مقبول صنعت مراعات النظیر بھی ہے۔ اہل فن جانتے ہیں کہ اس صنعت کے ذریعے بھی کلام کے حسن کو دوبالا کیا جا سکتا ہے۔ اس صنعت کے استعمال سے جہاں کلام میں ندرت اور دل کشی بڑھتی ہے وہیں شاعر کی

چابک دستی بھی ظاہر ہوتی ہے۔شاعر محض شاعر ہی نہیں ہوتا بل کہ وہ ایک مصور بھی ہوتا ہے۔شاعر کے ہاں مختلف لفظی تصاویر یوں پائی جاتی ہیں جن میں ایک خط سے دوسرا خط جڑا ہوا ہوتا ہے۔الفاظ کو یوں ترتیب دینا کہ ایک لفظ کی رعایت سے دوسرا لفظ آئے اور مکمل ایک تصویر بن جائے تو ایسی صنعت گری مراعات النظیر کہلاتی ہے۔شعرا کے ہاں اس صنعت کا استعمال ان کی فنی چابک دستی کا ثبوت ہے۔شاعر بعض اوقات مظاہر فطرت سے متعلق اشیا کو یوں استعمال کرتا ہے آسمان کی نسبت سے چاند،سورج،ستارے،بادل،بارش وغیرہ آجاتے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ دریا کی نسبت سے کشتی بھنور،موج،مچھلی،پانی، وغیرہ،کواستعمال کرنا۔افتخار مغل کے کلام میں مراعات النظیر کا استعمال ان کی فنی چابک دستی کا پتا دیتا ہے۔افتخار مغل کی چوں کہ شاعری پر مکمل دسترس تھی،اس لیے ان کے ہاں مراعات النظیر بھی موجود ہے۔افتخار مغل کے کلام سے مراعات النظیر کی مثالیں ملاحظہ ہوں۔

یہ دل کا روگ، یہ آنکھوں میں انتظار، یہ خواب
کسی عذاب ہیں اک آرزو کے ہونے سے

(افتخار مغل،انکشاف،ص۱۴۲)

آرزو کی رعایت سے روگ،انتظار،خواب وغیرہ کے الفاظ مراعات النظیر ہیں۔

میں ابنِ ارض ہوں میرا نسب مری مٹی
جو خاک زاد نہیں مجھ سے سلسلہ نہ رکھے

(افتخار مغل،انکشاف،ص۱۴۹)

ارض کی نسب سے خاک زاد اور مٹی مراعات النظیر کی مثالیں ہیں۔

اسلوب:

کسی بھی شاعر کے لیے اس کا اسلوب بنانا مشکل مرحلہ ہے۔اسلوب کے بننے میں شاعر کے ہر طرح کے حالات کارفرما عمل ہوتے ہیں۔شاعری میں ایک الگ انداز اور اس کے ساتھ ہیتا ور مخصوص طرز تحریر کسی بھی شاعر کو منفرد مقام بخشتا ہے۔اسلوب اظہار کے نتیجے میں عمل میں آتا ہے۔اسلوب اظہار کی لذت بخش خصوصیات مختلف ومتعدد ہوتی ہیں۔مثال کے طور پر کسی بھی شاعر کے ہاں منفرد الفاظ کی خوش آہنگی مختلف الفاظ یا مختلف مجموعہ ہائے الفاظ کی ہم آہنگی،کسی ترکیب یا

جملے کی نغمہ خیزی الفاظ یا تراکیب کے باہمی فعل وانفعال سے نئے نئے مطالب ومعنی پیدا کرنا بھی کسی شاعر کے اسلوب کا حصہ ہوسکتا ہے۔علاوہ ازیں الفاظ کے ساتھ ساتھ دیگر شعرا کے زیر اثر آنا اوران کے تخیل اور زمین سے استفادہ کرنا بھی اسلوب کا حصہ ہوسکتا ہے۔افتخار مغل کے ہاں منفرد اندازتحریر خاص مضامین فراز سے عقیدت،میر سے محبت اور غالب واقبال کا اثر تو ملتا ہی ہے ساتھ ہی اپنی محبوبہ کی خوبی ومحبوبی سے قاری کو متاثر کرنے کے لیے تعریفوں کے پل باندھتے ہیں۔افتخار مغل کے پاس حقیقی معنوں میں شاعری کا ایک ایسا ساز ہے جس کی لے پر ہر وہ اپنے قاری کو مدہوش اور گم سم کر دیتے ہیں۔ ان کے اسلوب میں بندش مضامین اور خیال آفرینی کی نیرنگی موجود ہے۔افتخار مغل کے اسلوب میں ایک یہ چیز بھی اہم ہے کہ ان کے ہاں ان کا مکمل نام افتخار مغل جا بہ جا استعمال کیا گیا ہے۔گو کہ اس کے اس عمل سے ان کی شعریت مجروح ہوئی لیکن ایسا بھی نہیں کہ ہر جگہ ہیں ایسا ہوا ہے۔افتخار مغل کے ہاں ان کے نام کو بہ طور تخلص دیکھیں:

میں اک شہابِ شکستہ تھا افتخار مغل
بجھا ضرور مگر خوب جگمگا کے بجھا

(افتخار مغل،انکشاف،ص۱۴۹)

ہم ایک دوسرے کا دکھ ہیں افتخار مغل
تمام عمر یہی طے رہا ہے ہمارے بیچ

(افتخار مغل،انکشاف،ص۱۶۱)

تو کیا طلسم تھا؟ اس روز افتخار مغل
وہ بولتی تو کھنکتے تھے لفظ کانوں میں

(افتخار مغل،انکشاف،ص۱۸۵)

درج بالا اشعار کے علاوہ افتخار مغل کے ہاں اکثریت مقطعوں میں ان کا پورا نام بہ طور تخلص دیکھا جا سکتا ہے۔اس کے علاوہ افتخار مغل کے اسلوب کا ایک خاص حصہ ان کا وہ کلام ہے جو دیگر شعرا کی زمینوں میں لکھا گیا۔یا پھر دیگر شعرا سے متاثر نظر آتے اور اپنے کلام میں ان کو جواب دیا۔اس حوالے سے احمد فراز کی زمین میں کچھ اشعار دیکھیں:

احمد فراز:

گل بھی گلشن میں کہاں غنچہ دیں تم جیسے
کوئی کس منہ سے کرے تم سے سخن تم جیسے

(احمد فراز،غزل بہانہ کروں،ص۱۲۱)

افتخار مغل:

اب کہاں شہر میں وہ آئینہ تن تم جیسے
باندھ کر لے گئے سب روپ کا دھن تم جیسے

(افتخار مغل،انکشاف،ص۱۴۴)

میر تقی میر کے ایک شعر کے جواب میں افتخار مغل کا شعر دیکھیے

مجھے بھی آتے ہیں سب عشق کے ادب آداب
مگر میں آدمی ہوں! میں غبار میر نہیں

(افتخار مغل،انکشاف،ص۲۳۳)

میر تقی میر:

دور بیٹھا غبار میر ان سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

(میر تقی میر،کلیات میر،ص۱۲۳)

اس طرح احمد ندیم قاسمی اور غالب کے اشعار سے افتخار مغل کس طرح متاثر ہوئے ملاحظہ کریں۔

افتخار مغل:

بس آپ اور کیا کرتے ہیں اپنی حالت پر
ہم اپنے ساتھ کوئی نوحہ گر نہیں رکھتے

(افتخار مغل،انکشاف،ص۲۴۷)

غالب:

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں

مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

(مرزا غالب، دیوان غالب، ص۱۳۸)

افتخارؔ مغل:

آ کر بھی انسان کو موت نہیں آتی ہے

جا کر بھی یہ دریا پیچھے رہ جاتا ہے

(افتخارؔ مغل، انکشاف، ص۲۱۹)

احمد ندیم قاسمی:

کون کہتا ہے موت آئی تو مر جاؤں گا

میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا

(احمد ندیم قاسمی، ندیم کی غزلیں (کلیات)، ص۴۱۴)

افتخارؔ احمد مغل کے اسلوب میں جہاں دیگر لوازمات پائے جاتے ہیں وہیں ان کے کلام میں دیگر شعرا کا ذکر بھی بہتات سے ملتا ہے۔ مثال کے طور پر مصحفیؔ، احمد حسین مجاہدؔ، آصف ثاقبؔ، ساقیؔ فاروقی، غالبؔ، اقبالؔ، فرازؔ وغیرہ کا ذکر اکثر اشعار میں پایا جاتا ہے۔ یہ چیز اس بات کی علامت بھی ہے کہ افتخارؔ مغل کی شخصیت میں اساتذہ سے اور دوستوں سے کس قدر محبت اور الفت پائی جاتی ہے۔ انھوں نے شعر جیسے نازک آبگینوں میں بھی اپنے محسنوں اور اساتذہ فن کو نہ بھولا۔ لیکن اپنے اشعار کو ان ناموں سے مزین کرنے سے ان کی شاعری میں شعریت کا رنگ ضرور ماند پڑا ہے۔ افتخارؔ مغل کے کلام میں سے چند ایسے اشعار ذیل میں ہیں جن میں ایسے ہی کچھ نام موجود ہیں۔

یہ زیست بھی ساقیؔ کی کوئی نظم ہے شاید

سو رنگ سے اس نظم کا عنوان کھلا ہے

(افتخارؔ مغل، انکشاف، ص۱۳۹)

وہی رکھے در ثاقبؔ سے افتخارؔ پیار

جو شخص اپنی طبیعت قلندرانہ رکھے

(افتخارؔ مغل، انکشاف، ص۱۴۹)

ولیؔ ہوا میرؔ تقی، مصحفیؔ کہ انیسؔ

عجیب طرح کے انساں ہیں ان فسانوں میں

(افتخارؔ مغل، انکشاف، ص۱۶۵)

درج بالا اشعار میں ساقیؔ فاروقی، بوئی ہزارہ کے بزرگ شاعر آصف ثاقبؔ کے علاوہ ولیؔ دکنی، میرؔ، مصحفیؔ اور انیسؔ کا ذکر کچھ مثالیں ہیں۔

واحد اعجاز میرؔ
مختصر حالات زندگی

واحد اعجاز میرؔ کے اجداد مقبوضہ کشمیر سے ہجرت کر کہ مظفر آباد کے علاقے گوجرہ میں رہائش پذیر ہوئے۔ گوجرہ میں ہی ان کی ولادت چھے مئی ۱۹۷۷ء کو ہوئی گورنمنٹ ہائی اسکول گوجرہ سے ۱۹۹۵ء میں میٹرک پاس کرنے کے بعد انٹر میڈیٹ انجینئرنگ میں داخلہ لیا۔ طبعیت میں لاابالی پن اور شاعری کا جنوں تعلیم کی راہ میں رکاوٹ بنا تو گھر سے بھاگ کر لاہور چلے گئے ۔قریباً دو سال لاہور میں رہنے کے بعد واپس مظفر آباد آئے۔ لاہور قیام کے عرصے میں وہاں کی ادبی مجالس نے ان کے شعری ذوق کو مزید جلا بخشی واحد اعجاز میرؔ بتاتے ہیں:

''لاہور میں تعیناتی کی یہ مدت میرے لیے اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ اس عرصے میں ادبی محافل اور مشاعروں میں شرکت کرنے سے میرے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اس دور میں میری شاعری میں پہلے کی نسبت خاصی بہتری آئی۔''۲۶

واحد اعجاز میرؔ نے لاہور سے واپس پلٹ کر دوبارہ تعلیم سے سلسلہ جوڑا اور انٹرمیڈیٹ اور گریجویشن کے امتحانات پاس کرنے کے بعد ۲۰۰۵ء میں جامعہ آزاد جموں و کشمیر سے انگریزی میں ماسٹر کر لیا۔ یہی عرصہ تھا جب واحد اعجاز میرؔ اپنی عملی زندگی میں داخل ہوئے اور نجی تعلیمی اداروں میں پڑھانا بھی شروع کر دیا۔ ایم۔اے انگریزی کے دوران آزاد کشمیر کے معروف ماہر تعلیم اور شاعر پروفیسر ڈاکٹر ندیمؔ حیدر بخاری کی صحبت نے واحد اعجاز میرؔ کا حوصلہ بڑھایا اور اسی عرصے میں یعنی ۲۰۰۳ء میں واحد اعجاز میرؔ کا پہلا شعری مجموعہ ''راستہ مت بدل'' کے نام سے منظر عام پر آ گیا۔ ندیمؔ حیدر بخاری سے واحد اعجاز میرؔ کے استاد اور شاگرد کے رشتے کے علاوہ دوستانہ مراسم بھی قائم ہو گئے ۔انگریزی زبان و ادبیات میں ایم۔اے کرنے کا اثر واحد اعجاز میرؔ کی دوسری کتاب'' آواگون''میں واضح نظر آتا ہے۔ اپنے بول چال اور شاعری میں دل چسپی کے باعث اکثر لوگ ان کو اردو ہی کا استاد مانتے ہیں۔ واحد اعجاز میرؔ نے باقاعدہ شاعری میں کسی سے اصلاح نہیں لی بل کہ شاعری ان کے رگ و خوں میں پیدائشی طور پر موجود ہے۔

فنی جائزہ:

واحد اعجاز میرؔ کی شاعری آزاد کشمیر اور پاکستان میں مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔ ان کے ہاں تمام شعری رموز اور

موضوعات موجود ہیں۔ نظم وغزل دونوں میں طبع آزمائی کی لیکن جو شہرت ملی وہ غزل کے میدان میں ملی۔ واحد اعجاز میؔر کے ایک شعر زبان زد عام ہوا۔

یہ جو ہم لوگ ہیں احساس میں جلتے ہوئے لوگ
ہم زمیں زاد نہ ہوتے تو ستارے ہوتے

(واحد اعجاز میر، راستہ مت بدل، ص ۷۰)

فنی اعتبار سے واحد اعجاز میؔر کی شاعری کو دیکھا جائے تو ان کے ہاں فنی لوازمات پورے ملتے ہیں۔ صنائع بدائع اور علم بیاں کے ساتھ ساتھ بحروں کے استعمال پر دسترس پائی جاتی ہے۔ واحد اعجاز میؔر کے ہاں صنعتوں کا استعمال بہت خوب صورتی سے کیا گیا ہے۔ ان کے اس استعمال کو دیکھ کر قاری کے لیے یہ اندازہ لگانا قطعاً مشکل نہیں کہ قدرت نے ان کے لیے شعر کہنے میں کتنی آسانی پیدا کر دی۔ انھوں نے اپنے کلام میں حسن، نزاکت اور زور پیدا کرنے کے لیے تشبیہ واستعارے سے بھی خاطر خواہ استفادہ کیا ہے۔

تشبیہات واستعارات:

اردو شعرا نے کلاسیکی روایت سے جدت تک کے سفر میں تشبیہات واستعارات سے بہت زیادہ استفادہ کیا ہے۔ واحد اعجاز میؔر کے ہاں اس لیے بھی تشبیہات کی کمی نہیں کہ وہ میؔر کے خانودے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کو میؔر سے خصوصی دل چسپی رہی ہے۔ میؔر کے علاوہ دیگر کلاسیکی شعرا ان کے مطالعے کا حصہ رہے۔ انھوں نے تشبیہات کے استعمال اور استعارات کا استعمال اپنی فطری صلاحیت کی بنا پر بہت نفاست سے کیا ہے۔ انھی تشبیہات واستعارات نے واحد اعجاز میؔر کے کلام میں معنویت کے ساتھ ساتھ حسن بھی پیدا کر دیا ہے۔ واحد اعجاز میؔر کے ہاں تشبیہات کے حامل اشعار دیکھیں:

اپنے زخموں بھرے جسم کو سرخ پھولوں کی ڈالی سمجھ
دیکھنے ہیں ہمیں ڈل میں کھلتے کنول، راستہ مت بدل

(واحد اعجاز میر، راستہ مت بدل، ص ۴۷)

واحد اعجاز میؔر نے تشبیہات بھی منفرد استعمال کی ہیں اس شعر میں غموں کو دیمک جیسا کہنا جدید رنگ ہے۔ غم انسان کو کھا جاتا ہے یہ بات پرانی ہے لیکن واحد اعجاز میؔر نے اس کو ایسے بتایا ہے کہ غم ایسے ہی کھاتا ہے جیسے دیمک لکڑی کو کھا جاتی

ہے۔

یہ جو آنسو ہیں مری پلکوں پہ پانی جیسے
اس کی آنکھوں سے ابھرتے تو ستارے ہوتے

(واحد اعجاز میر، راستہ مت بدل، ص۷۰)

اس شعر میں واحد اعجاز میؔر نے آنسوؤں کو پانی کے جیسا کہا ہے۔ دوسرے مصرعے میں یہ بات بھی اہم ہے کہ اگر عام آدمی کوئی اچھا کام کرتا ہے اسے اچھا نہیں ہوتا لیکن خواص کا ادنیٰ کام بھی اعلیٰ ہو جاتا ہے۔ چوں کہ واحد اعجاز میؔر کا محبوب خواص میں شمار ہے اس لیے یہ ہی آنسو جو ان کی آنکھ میں پانی جیسے ہیں جب اس کے محبوب کی آنکھ میں ہوتا تو ستاروں کی طرح ہو جائیں۔

واحد اعجاز میؔر کے ہاں تشبیہ کے حامل فرداً اشعار دیکھیں۔

ہم سمندر کی طرح چپ ہیں کہ ہم جانتے ہیں
ہم اگر صبر نہ کرتے تو قیامت کرتے

(واحد اعجاز میر، راستہ مت بدل، ص۷۲)

میں اس طرح ترے خوابوں میں سمٹا رہتا ہوں
کہ جیسے بچہ کوئی ہو لحاف میں بیٹھا

(واحد اعجاز میر، راستہ مت بدل، ص۱۰۲)

تشبیہات کی طرح واحد اعجاز میؔر کے ہاں استعارات کا استعمال بھی اچھوتے انداز میں ملتا ہے۔ مثال کے طور پر:

خاک پر جھلملا اپنی پلکوں پہ تارے سجا کھل کے رو
گرد پوروں سے چن اور چہرے پہ مل، راستہ مت بدل

(واحد اعجاز میر، راستہ مت بدل، ص۸۱)

آنسوؤں کو یہاں پلکوں کے ستارے کہا گیا ہے جو استعارے کی عام مثال ہے۔

جانے کیا حادثہ اس پھول سی لڑکی پہ ہوا

اک کسی بات پہ حیران نہیں ہوتی یار

(واحد اعجاز میر، راستہ مت بدل، ص۱۱۶)

جہاں میں نور ان کی ذات سے ہے
کئی سورج زمین پہ چل رہے ہیں

(واحد اعجاز میر، راستہ مت بدل، ص۴۸)

نبی کریم ﷺ نور کا پیکر تھے۔ ان کا جسم مظہر نور تھا واحد اعجاز میرؔ نے اس حقیقت کو نہ صرف خوب صورتی سے بیان کیا بل کہ نبی اقدسؐ کی ذات کے طفیل جو اولیاؒ اور صحابہ اکرام کی شان ہیں ان کو ''سورج'' کہا گیا ہے۔ اگر اللہ کے نبی نہ ہوتے تو دنیا میں یہ اللہ والے نہ ہوتے۔

نظر کی جھیل میں کوئی کنول کھلا کہ نہیں
بتاؤ آج بھی وہ شہر میں ملا کہ نہیں

(واحد اعجاز میر، راستہ مت بدل، ص۵۳)

واحد اعجاز میرؔ نے ایک عام سی بات کو خوب صورت انداز میں استعارے کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ نظر کی جھیل میں کنول کا کھلنا واحد اعجاز میرؔ کے قلم کی اور تخیل کی اوج کا اظہار ہے۔ کنول سے یہاں مراد ''محبوب'' ہے۔ محبوب کی ہی یہاں شاعر کے لیے ضروری اور بنیادی کام ہے۔

نہ جانے کون سی برسات اپنے من میں رکھتی ہے
محبت نرم کر دیتی ہے پتھر کی زمینوں کو!

(واحد اعجاز میر، راستہ مت بدل، ص۵۶)

آنسوؤں کے لیے برسات کو مستعار لیا گیا ہے۔

کہ تو پہلی پہلی بہار کا کوئی پھول ہو
جو کھلا ہو میری دعاؤں کی کسی شاخ پر

(واحد اعجاز میر، راستہ مت بدل، ص۴۳)

مراعات النظیر :

اردو کی مقبول صنعت مراعات النظیر جہاں کلام میں تازگی اور ندرت پیدا کرتی ہے وہیں اس کے استعمال سے شاعر کے فنی مہارت بھی سامنے آتی ہے۔ واحد اعجاز میرؔ کے کلام میں مراعات النظیر کے حوالے سے اشعار دیکھیں تو بیسیوں کی تعداد میں مل جائیں گے۔ انھوں نے اپنے کلام کو مراعات النظیر سے کس طرح مزین کیا ہے؟ مثال دیکھیں۔

شہر میں خامشی پھیل جاتی ہے، لب گونگے ہو جاتے ہیں
میرے احساس میں گنگنایا نہ کر، مسکرایا نہ کر

(واحد اعجاز میر، راستہ مت بدل، ص۴۹)

اس شعر میں واحد اعجاز میر نے لبوں کی نسبت سے خامشی، گونگے، اور گنگنایا کے الفاظ خوب صورتی سے یک جا کر کہ مراعات النظیر کی عمدہ مثال دی ہے۔

یار کیا جنگ تھی، جو ہار کے تم کہتے ہو
جیت جاتے تو خسارے ہی خسارے ہوتے

(واحد اعجاز میر، راستہ مت بدل، ص۶۹)

جنگ کی رعایت سے ہار، جیت اور خسارے مراعات النظیر ہیں۔

یہ جو آنسو ہیں مری پلکوں پہ پانی جیسے
اس کی آنکھوں سے ابھرتے تو ستارے ہوتے

(واحد اعجاز میر، راستہ مت بدل، ص۷۰)

ساری بستی ہے ظلمت میں ڈوبی ہوئی اور سب دل پہ رات اور رو کر سو گئے
اس نگر کے لیے ٹمٹمایا ہوا اک دیا کیا کرے اور خدا کیا کرے

(واحد اعجاز میر، راستہ مت بدل، ص ۸۱)

رات کی رعایت سے ظلمت، سونا، دیا، ٹمٹمایا ہوا وغیرہ مراعات النظیر ہیں۔

صنعت تضاد:

صنعتِ تضاد جس کو صنعتِ طباق یا صنعتِ بقت بھی کہا جاتا ہے۔ اس صنعت کے مطابق کلام میں دو ایسے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ جو ایک دوسرے کی ضد ہوں۔ تضاد بھی اردو کی مقبول ترین اور اہم ترین صنعت کے طور پر جانی جاتی ہے۔ شعرائے اردو کے ہاں یہ صنعت عموماً ملتی ہے۔ آزاد کشمیر کے شعرا میں بھی اس کی کمی نہیں۔ واحد اعجاز میؔر کے کلام میں اگر دیکھیں تو صنعت تضاد کے حامل کئی اشعار مل جائیں گے۔ یہ چیز ثبوت ہے کہ واحؔد اعجاز میر کے ہاں صنعتوں کا استعمال کس حد تک موجود ہے۔ واحد اعجاز میؔر کے کلام سے یہ مثالیں دیکھیں جن میں تضاد موجود ہے۔

ہجر کے وصال کے خمار کے
خواب دیکھتے ہیں اپنے یار کے

(واحد اعجاز میر، آواگون، ص ۱۰۱)

کئی چراغ سرِ شام آنکھ کھولتے ہیں
کئی چراغ سحر کو جگائے جاتے ہیں

(واحد اعجاز میر، آواگون، ص ۱۶۳)

یہ کب کہا ہے کہ سارا جہان خالی ہے
مری زمین مری آسمان خالی ہے

(واحد اعجاز میر، آواگون، ص ۶۷)

کوئی تو فیصلہ ہو قید سے رہائی ہے
وہ میرے نام کا سکہ اچھالتا بھی نہیں

(واحد اعجاز میر، آواگون، ص ۱۳۰)

صنعتِ تلمیح:

کلام میں ایسے الفاظ کا استعمال کرنا یا ایسے مضامین کا استعمال کرنا جن میں کسی قصے یا واقعہ یا علمی مسئلے کی طرف اشارہ ہو علم بدیع کی اصطلاح میں تلمیح کہلاتا ہے۔ تلمیح بھی کلام کے حسن میں اضافے کا باعث بنتی ہے اور شاعر کے تاریخی شعور کا پتا دیتی ہے۔ واحد اعجاز میرؔ کے ہاں بھی تلمیحات کا استعمال جا بہ جا نظر آتا ہے۔ انھوں نے اپنے کلام کو خوب صورت تلمیحات سے آراستہ کیا ہے جیسا کہ:

جہاں جہاں کوئی کچا گھڑا تھا سوہنی تھی
وہاں وہاں پہ چناب آ گئے ہیں رات کی رات

(واحد اعجاز میر، راستہ مت بدل، ص ۳۷)

میں کہ عیسیٰ ہوں نہ منصور ہوں لیکن پھر بھی
ایک بے نام سا رشتہ ہے مرا دار کے ساتھ

(واحد اعجاز میر، راستہ مت بدل، ص ۲۹)

لبِ فرات پہنچ کر ہوئی خبر مجھ کو
کہ منتظر ہے نئی کربلا فرات کے بعد

(واحد اعجاز میر، راستہ مت بدل، ص ۲۵)

راستے میں چناب آئیں یا بیلے کہ تھل راستہ مت بدل
میں ترے ساتھ ہوں آ میرے ساتھ چل، راستہ مت بدل

(واحد اعجاز میر، راستہ مت بدل، ص ۴۵)

صنعتِ ترافق:

واحد اعجاز میرؔ کا کلام شاعرانہ حسن سے بھرپور ہے۔ انھوں نے صنعتوں کا خوب صورت استعمال کیا ہے۔ ترافق علم بدیع کی ایسی صنعت ہے جس کے مطابق کسی بھی شعر کی ترتیب اُلٹنے سے اُس کا مفہوم برقرار رہتا ہے۔ شعر کے مصرع اول کو

مصرع دوم کی جگہ رکھنے سے بھی معنی قائم رہتا ہے۔ واحد اعجاز میرؔ کے ہاں صنعت ترافق کے حامل اشعار ملاحظہ ہوں۔

جس قدر وقت اب تیز چلتا ہے ایسا نہ تھا
ابھی وقت کو ہم نے بازو پہ باندھا نہ تھا

(واحد اعجاز میر، آواگون، ص۸)

درجہ بالا اشعار میں اگار ترتیب الٹیں تو اس سے بھی معنی اور شعر کی نزاکت قائم رہتی ہے۔

اپنے اندر کے شعلوں میں جلتا رہا
زمانے بدلتے رہے میں بدلتا رہا

(واحد اعجاز میر، آواگون، ص۱۴)

تو کیا ہوا جو نہیں کوئی دوسرا مرے ساتھ
مرا یقیں ہے کہ ہر سانس ہے خدا مرے ساتھ

(واحد اعجاز میر، راستہ مت بدل، ص۱۹)

واحد اعجاز میرؔ کے ہاں درجہ بالا اشعار میں صنعت ترافق موجود ہے۔ اگر ان اشعار کو الٹ کر پڑھیں تو بھی ان کی معنویت برقرار رہے گی۔

سفر کی ٹھان کہ دیمک لگی ہوئی مجھے
بدل مکان کہ دیمک لگی ہوئی ہے مجھے

(واحد اعجاز میر، راستہ مت بدل، ص۵۷)

سہل ممتنع:

واحد اعجاز میرؔ کی شاعری میں ان کے فن کی بھرپور عکاسی ہے۔ یہی وجہ ہے جب احمد ندیمؔ قاسمی تک واحد اعجاز میرؔ کا کلام پہنچا تو وہ بھی اس فن کار کی تازہ کاری کے اسیر ہوئے بنا نہ رہ سکے۔ احمد ندیمؔ قاسمی نے کلام کی موصولی پر جو خط لکھا وہ اس بات کا ثبوت ہے۔ احمد ندیمؔ قاسمی ۲۵ مئی ۲۰۰۲ء کو واحد اعجاز میرؔ کے نام خط میں لکھتے ہیں:

''میں عزیزی افتخارؔ مغل کا ممنون ہوں کہ انھوں نے مجھے آپ کا کلام بھجوایا اور یوں

جو ہر قابل کا سراغ لگانے کے سلسلے میں ''فنون'' کی نیک نامی میں اضافہ ہوا۔ آپ کے کلام میں جان تھی جو ہر تھا، چناں چہ میں نے آپ کی غزلیں ''فنون'' میں درج کیں۔ یوں آپ کے کلام کا حسن ہی آپ کی سفارش ثابت ہوا۔'' ۲۷

احمد ندؔیم قاسمی کے الفاظ کس قدر سچے اور کھرے ہیں واحد اعجاز میؔر کے کلام کو دیکھ کر قاری کو اس کا بہ خوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ آزاد کشمیر کے شعری ادب میں واحد اعجاز میؔر نے بہت کم وقت میں جو بہت زیادہ نام کمایا وہ یقیناً ان کے کلام کی پختگی کا ثمر ہے۔ واحد اعجاز میؔر نے جہاں فنی لوازمات میں دیگر صنعتوں کو نبھایا وہیں سہل ممتنع کو بھی ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ سہل ممتنع یقیناً آسان نہیں کہ آپ کلام کو اس حد تک سادہ اور آسان بنا دیں کہ اس کے بعد وہ نثر میں ڈھل جائے۔ واحد اعجاز میؔر کے ہاں سہل ممتنع کے حوالے سے چند اشعار بہ ذیل ہیں:

درد آباد نہ ہو جائے کہیں
شہر برباد نہ ہوجائے کہیں

(واحد اعجاز میر، راستہ مت بدل، ص۳۷)

اس شعر کے اندر سہل ممتنع یوں ہے کہ واحد اعجاز میؔر نے بہت بڑی بات نہایت آسان پیرائے میں بیان کر دی ہے۔ اگر شہر میں درد ہوگا اور غموں کی حکومت ہوگی تو یہ شہر پھر ویراں اور بیاباں بن جائے گی۔ انھوں نے یہاں یہ خدشہ بھی ظاہر کیا ہے کہ حالات نے درد کو بڑھوتری دے دی ہے۔

مری سچائی بہت سادہ ہے
اس کا اظہار بہت مشکل ہے

(واحد اعجاز میر، آواگون، ص۱۹۱)

جس کا امکان ہی نہیں کوئی
ایسے مکاں میں پڑے ہوئے ہیں

(واحد اعجاز میر، آواگون، ص۲۲۷)

جیتنے کے بھی کسے ہو گی خوشی
کون روئے گا ہماری ہار پر

(واحد اعجاز میر، راستہ مت بدل، ص ۶۴)

بحروں کا استعمال:

کسی بھی شاعر کے لیے بحروں کے استعمال فنی رموز میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ کوئی بھی شاعر اس وقت تک کامل نہیں ہوسکتا جب تک وہ بحر کے استعمال میں ماہر نہ ہو۔ اردو شاعری میں جتنے بھی اہم نام ہیں سبھی کے ہاں طویل بحروں اور چھوٹی بحروں پر دسترس نظر آتی ہے واحد اعجاز میؔر کی شاعری چوں کہ روایت کی پاس داری کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ان کا خمیر جس مٹی سے اٹھا اس میں شاعری ازل سے رچی ہوئی تھی۔ اس وجہ سے بھی ان کے کلام میں مختصر اور طویل ہر دو طرح کی ۔بحروں کا استعمال نظر آتا ہے۔ گو کہ طویل بحر اور چھوٹی بحر دونوں میں اعلیٰ شعر نکالنا خاصا مشکل فن ہے لیکن واحد اعجاز میؔر نے اس مشکل کام کو بہ آسانی سرانجام دیا ہے۔ ان کے کلام میں سے طویل بحر کے اشعار دیکھنے سے اس بات کا اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ انھوں نے طویل بحر کو کس قدر نفاست سے استعمال کیا ہے۔

بے یقینی کی دیمک ہے دل کہ لگی، التجا کیا کرے اور خدا کیا کرے
ایک آنسو، ہتھیلی پہ گرتا نہیں، سو دعا کیا کرے اور خدا کیا کرے

(واحد اعجاز میر، راستہ مت بدل، ص ۶۴)

آنسوؤں سے بدن سارا بھر جائے گا، میں نے سوچا نہ تھا
اس طرح تو مجھے چھوڑ کر جائے گا، میں نے سوچا نہ تھا

(واحد اعجاز میر، راستہ مت بدل، ص ۹۳)

آبلے تو سفر کی شروعات ہیں، ان کو خود چھوڑ دے
تب کہیں جا کہ دکھ خون میں ہو گا حل، راستہ مت بدل

(واحد اعجاز میر، راستہ مت بدل، ص ۴۵)

اس طرح چھوٹی بحر میں بھی واحد اعجاز نے اپنے فن کا بھر پور جادو جگا دیا ہے۔ ان کے چھوٹی بحر میں بے مثال اشعار کی کمی نہیں لیکن مثال کے لیے چند اشعار پیش خدمت ہیں۔

زندگی بنی ہوئی تھی خامشی
قتل کر دیا مجھے پکار کے

(واحد اعجاز میر، راستہ مت بدل، ص۵۴)

زندگی منتظر آپ کی
زندگی کی طرف آیئے

(واحد اعجاز میر، آوا گون، ص۱۰۶)

رند و پرہیزگار زندہ باد
جس پہ جو آشکار زندہ باد

(واحد اعجاز میر، آوا گون، ص۱۳۲)

کثیر لفظی ردیف:

ردیف کا استعمال کرنا بھی کسی مہارت سے کم نہیں اکثر شعرا نے غیر مردف غزلیات بھی کہیں جیسے کہ اقبال کے ہاں اکثر غیر مردف غزلیں موجود ہیں۔ لیکن غزل کے لیے ردیف کا استعمال کرنے والے شعرا کی تعداد نسبتاً زیادہ ہے۔ ردیف یک لفظی دو لفظی اور سہ لفظی ہو سکتی ہے۔ واحد اعجاز میر کے ہاں ردیف کا استعمال جو کیا گیا ہے وہ کثیر لفظی ہے ان کی اکثر غزلوں میں طویل ردیف ہے۔ مثال کے طور پر

شہر کا شہر مجھ سے پرایا نہ کر مسکرایا نہ کر
چلتے پھرتے مجھے یاد آیا نہ کر، مسکرایا نہ کر

(واحد اعجاز میر، راستہ مت بدل، ص۴۹)

کہاں کہاں سے وضاحت کروں گا میں غم کی

بس اتنا جان کر دیمک لگی ہوئی ہے مجھے

(واحد اعجاز میر، راستہ مت بدل،ص ۵۷)

میں تیرا بوجھ اٹھانے کا کہہ رہا ہوں مگر
مری مان کہ، دیمک لگی ہوئی ہے مجھے

(واحد اعجاز میر، راستہ مت بدل،ص ۵۷)

راستہ مجھے کو کہتا ہے چھوڑوں تجھے، راستے پرمرے واسطے بے اثر
مرے پیروں سے لپٹے ہوئے ہیں سفر راستہ کیا کرے اور خدا کیا کرے

(واحد اعجاز میر، راستہ مت بدل،ص ۱۱۷)

درجہ بالا اشعار میں ''نہ کر، مسکرایا نہ کر'' ''کہ دیمک لگی ہوئی ہے مجھے'' اور'' کیا کرے اور خدا کیا کرے''، کثیر الفظی ردیف کی مثالیں ہیں۔

تمثال کاری/تصویریت:

فنونِ لطیفہ یعنی مصوری، موسیقی، رقص اور شاعری وغیرہ میں سے شاعری اور موسیقی کے سوائے ہر فن کا کوئی نہ کوئی بصری تمثال ہوتا ہے۔ موسیقی اور شاعری اس خامی کے باعث ہی شاید آج تک فنونِ لطیفہ کی فہرست میں شامل ہونے کے حوالے سے تناؤ کا شکار ہیں۔ باوجود اس کے یہ فنون کبھی تصویریت کی اس خوبی سے خالی نہیں ہیں۔ تمثال نگاری بھی ایک قسم کی منظر نگاری ہی ہے جو لطیف، حساس اور خوب صورتی کے زمرے میں آتی ہے۔ شاعری کے جسم کے لیے تمثال کی اہمیت وہی ہو سکتی ہے جو انسانی جسم کے لیے روح کی ہے۔ جب جسم سے روح الگ ہو جاتی ہے تو جسم بے جان ہو جاتا ہے۔ شاعری میں کسی بھی شاعر کے پردہ خیال پر ایک تمثال بلوغ کے ساتھ ساتھ روشن ہوتی چلی جاتی ہے۔ مرکب تمثال خیال میں کم نظر آتے ہیں۔ شاعر ہمیشہ اس کی جستجو میں لگا رہتا ہے۔ انیسؔ ناگی کے بقول:

> ''شاعری بذات خود جذبات اور احساسات کے اظہار کی زبان ہے۔ جس طرح قواعد وضوابط کے سہارے مافی الضمیر کا اظہار کرتی ہے اس طرح شاعری انسانی شخصیت کے جذبات، تصوراتی اور احساساتی منطقوں تشکیل اور اظہار کے لیے آپ کو مختلف لسانی

وظائف میں منقسم کرتی ہے۔''۲۸

تمثال کاری کی وجہ شاعر اپنے کلام میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ تصاویر بنا تا رہتا ہے۔ واحد اعجاز میؔر کے کلام میں تمثال کاری کا فن کہیں کہیں اپنی چھاپ دکھا دیتا ہے۔ وہ لفظوں سے پیکر تراشی کرتے ہیں۔ واحدؔ اعجاز کو الفاظ کی بصری تصاویر بنانے کا فن خوب آتا ہے جس سے وہ شاعری میں کچھ ایسے رنگ بھر دیتے ہیں کہ جو پڑھنے کے ساتھ ساتھ ذہن کے قرطاس پر مکمل تصویر بن جاتی ہے۔ واحد اعجاز میؔر کے ہاں لفظی تصویر کشی کا فن مکمل روح کے ساتھ ملتا ہے۔ پیکر خیال کو لفظی لبادہ پہنانے میں واحد اعجاز میؔر خاصے ماہر ثابت ہوئے ہیں۔ ان کی لفظی تصویر کشی درج ذیل اشعار میں دیکھی جا سکتی ہے۔

معجزہ اور کوئی میں تو کھا پایا نہیں
چاند لا کر تیرے ماتھے پہ سجایا ہے کہ بس

(واحد اعجاز میر، راستہ مت بدل، ص۲۲)

اپنی پلکوں کو اٹھا روک لے رستہ میرا
ورنہ جانے دے مجھے آخری انکار کے ساتھ

(واحد اعجاز میر، راستہ مت بدل، ص۲۹)

ڈول جاتی ہے خوش بو سے بوجھل ہوا
تجھ سے کتنا کہا، کھول کر بال راہوں میں آ نہ کر، مسکرایا نہ کر

(واحد اعجاز میر، راستہ مت بدل، ص۴۹)

فکری جائزہ:

فن کے ساتھ ساتھ فکری سطح پر بھی واحد اعجاز میؔر کی پختگی واضح ہے۔ واحد اعجاز میؔر کے ہاں بھی فکری سطح بہت بلند ہے ان کی شاعری میں وہ تمام حقائق اور موضوعات ملتے ہیں جن کی کسی بھی کشمیری شاعر سے توقع کی جا سکتی ہے۔ واحدؔ اعجاز کی شاعری میں مزاحمتی رنگ، کشمیر، رجائیت، وصال، ہجر، قنوطیت، عوامی و سماجی شعور، اور عالمی رویوں کے اثرات موجود ہیں۔ وہ مذہبی اعتبار سے بھی ایک مضبوط شاعر ثابت ہوئے ہیں۔ دیگر شعرائے کشمیر کی نسبت انھوں نے واقعہ کربلا کا زیادہ اثر قبول کیا ہے جو ان کی غزل میں نمایاں نظر آتا ہے۔ واحد اعجاز میؔر آزاد کشمیر کے شعری ادب کو جو وسعت بخشی ہے اس

بارے میں پروفیسر اعجاز نعمانی کہتے ہیں:

''آزاد کشمیر میں اردو غزل کو بالخصوص جن لوگوں نے اعتبار بخشا ہے ان میں واحد اعجاز میر بھی ایک ہیں۔ یہ ایک ایسا شاعر ہے جو شاعرانہ زندگی کی تمام تر تساہل پسندی کی رومانویت کو اپنا اثاثہ سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک زندگی کی دیگر تمام تر حقیقتیں اور لوازمات ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔'' ۲۹

انا پرستی:

واحد اعجاز میر مردِ کہستانی ہیں۔ ان کو حوصلہ ان پہاڑوں کی طرح بلند اور سخت ہے۔ ان کے ہاں کوئی بھی بات ناممکن نہیں ڈر اور خوف ان کی شاعری میں کہیں نہیں ملتا ہاں وہ کسی بھی کام سے اس وقت تک پیچھے نہیں ہٹتے جب تک ان کی سانس میں سانس اور ان کے شانوں پر سر سلامت ہے۔ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ اپنی انا کو کبھی بھی مجروح نہ ہونے دیا جائے۔ انا ان کی سرشت میں ہے لیکن یہ انا منفی نہیں مثبت ہے۔ وہ اپنے حق کے لیے اپنی جان قربان کر دینا بھی معمولی سمجھتے ہیں جس کا اظہار ان کے بذیل اشعار میں ملتا ہے۔

ہزار شکر کہ بکھرا ہوں اپنے گھر آ کر
ہزار شکر وہی سارا ان انا مرے ساتھ

(واحد اعجاز میر، راستہ مت بدل، ص ۱۹)

وہ ٹوٹتے بھی ہیں تو اس مقام پر جب وہ اپنے گھر کی دہلیز عبور کر لیتے ہیں۔ کسی کے سامنے ٹوٹنا اور گرنا ان کو کسی طور گوارا نہیں۔

سر گرے میرا تو لے جائے قبیلہ تجھ کو
اتنی آسانی میں تجھ کو نہیں ہاروں گا

(واحد اعجاز میر، راستہ مت بدل، ص ۲۹)

سر بھلے میرا ہے دستار مرے باپ کی ہے

سر تو ہاروں گا میں دستار نہیں ہاروں گا

(واحد اعجاز میر، راستہ مت بدل، ص۲۰)

مری شکست مکمل تو کر کے جاتے تم

یہ کیا کہ زعم انا رہ گیا میرے پاس

(واحد اعجاز میر، راستہ مت بدل، ص۲۹)

واحد اعجاز میؔر کے پاس انا ہی وہ ہتھیار ہے جس کی وجہ سے کوئی ان کو شکست نہ دے پایا وہ ہر میدان میں سرخرو رہے کیوں کہ جھکنا اور پلٹنا ان کے لہو میں نہیں اس بات کا اظہار وہ بار بار کرتے ہیں۔

لوٹنا میرے لہو میں نہیں شامل لوگو

چل پڑوں میں تو مجھے کوئی صدا مت دینا

(واحد اعجاز میر، راستہ مت بدل، ص۵۱)

خوں کا اک قطرہ بھی ہو گرم جو مجھ میں تو مجھے

ناخدا ، کشتی، کنارا یا دعا مت دینا

(واحد اِعجاز میر، راستہ مت بدل، ص۵۱)

یار دریا بڑے گھمنڈ میں ہو

تم سمندر کو کاٹ دو گے کیا

(واحد اِعجاز میر، راستہ مت بدل، ص۵۴)

قنوطیت:

قنوطیت دبستان دہلی کی نمایاں خصوصیت ہے۔ یہ رجائیت کی ضد ہے۔ کشمیر کے باسی برسوں سے ظلم کے خلاف جنگ لڑ رہے ہیں۔ ان کے ہاں نا امیدی اور مایوسی روایتی انداز میں تو نہیں موجود تاہم قنوطیت کی ایک مختلف ان کی صحبت کے معاملے میں ضرور ہے۔ واحد اِعجاز میؔر کا خمیر بھی اسی سرزمین کا ہے وہ سرتاپا محبت کے جذبوں میں غرق نظر آتے ہیں۔ واحد اِعجاز میؔر کے اس وصف کا پتا ان کی وہ شاعری دیتی ہے جس میں محبت کرنا اور اور محبت کے دکھوں کا اظہار ملتا ہے۔ ان

کے کلام میں گو قنوطیت زیادہ نہیں تاہم جہاں انھوں نے اس فکر کو استعمال کیا ہے خوب کیا ہے۔

اپنے اندر کے شعلوں میں جلتا رہا
زمانے بدلے رہے، میں بدلتا رہا

(واحد اِعجاز میر، آوا گون، ص۱۴)

زندگی بنی ہوتی تھی خامشی
قتل کردیا مجھے پکار کر

(واحد اعجاز میر، آوا گون، ص۱۰۱)

کہاں کہاں سے وضاحت کروں گا میں غم کی
بس اتنا جان کہ دیمک لگی ہوئی ہے مجھے

(واحد اِعجاز میر، راستہ مت بدل، ص۵۷)

ہم تو آنسو ہیں کسی آنکھ سے بہ نکلیں گے
آپ کسی دل میں دھڑکنے کے لیے آئے ہیں

(واحد اِعجاز، راستہ مت بدل، ص۱۳۵)

کشمیر:

مٹی سے محبت ہر انسان کو فطرت کی طرف سے ملتی ہے۔کوئی بھی مذہب ہو وہ اپنی دھرتی اور اپنی مٹی سے وفا کا ہر پرچار کرتا ہے۔ارض وطن سے یہی فطری محبت کشمیر کے شعرا میں ملتی ہے۔جس طرح ہر کشمیری اپنے حقوق کے لیے اور اپنے وطن کے لیے اپنے اپنے حصہ کا کردار ادا کر رہا ہے ایسے ہی شعرائے آزاد کشمیر نے بھی اپنی محبت اور اپنے جذبات کے اظہار کے لیے لفظوں کا سہارا لیا ہے۔واحد اِعجاز میؔر کے اجداد چوں کہ کشمیر کے اس حصے سے ہیں جو بھارت کے قبضے میں ہے اس لیے بھی ان کے ہاں یہ کرب کچھ زیادہ ہے۔وہ کشمیر سے محبت کرتے ہیں یہ محبت ان کے کلام میں دیکھی جا سکتی ہے۔واحد اعجاز میؔر کے ہاں کسی نہ کسی صورت میں اسی سرزمین کی داستانیں موجود ہیں۔ان کی رگوں میں محبت ہی محبت ہے۔سعؔد اللہ شاہ کے مطابق:

''دریاؤں، جھیلوں اور جھرنوں کی نغمگی ، باغوں، چراگاہوں اور پہاڑوں کی کشادگی اس کے لاشعور کا حصہ ہے۔ واحدؔ اعجاز میر کی شاعری فطرت کی سچائی اور خوب صورتی سے جنم لیتی ہے۔ وہ ٹوٹ کر محبت کرنے والا، اپنی دھن کا پکا اور قول کا سچا فن کار ہے۔ وہ منافقت خودغرضی اور لالچ کے آلودہ معاشرے میں اپنے آپ کو مشکل میں محسوس کرتا ہے۔'' ۳۰

واحدؔ اعجاز میر کے لیے شعری روایت کی طرح وادیٔ کشمیر یوں بھی پرکشش ہے کہ یہ ان کی جنم بھومی ہے۔ انھوں نے اس دھرتی کے دکھ کو بہت قریب سے محسوس کیا ہے۔ نیلم اور جہلم کے ٹھنڈے اور شفاف پانی کو لہو رنگ ہوتے دیکھا۔ وادی کے نظارے آپ کی نگاہوں کو خیرہ کرتے ہیں۔ واحدؔ اعجاز میر کے کلام میں ان کا وطن کئی طرح سے نظر آتا ہے۔

اپنے زخموں بھرے جسم کو سرخ پھولوں کی ڈالی سمجھ
دیکھنے ہیں ہمیں ڈل میں کھلتے کنول، راستہ مت بدل

(واحد اعجاز میر، راستہ مت بدل، ص ۴۶)

ڈل وادی کی مشہور جھیل اور سیاحتی مقام ہے جس کی طرف واحدؔ اعجاز میر اشارہ کر رہے ہیں۔ وہاں وہ وطن کی خاطر لگنے والے زخموں کو پھول بتاتے ہیں اور اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ جھیل ڈل میں ایک روز ضرور پھول کھلتے ہوئے دیکھیں گے۔ وہ دن ضرور آئے گا جب وادی کو قابض فوج سے آزاد کرا لیا جائے گا۔

ہم نے نیلم اور جہلم میں لاشے آتے دیکھے
سنتے تھے ان دریاؤں میں سونا آتا ہے

(واحدِ اعجاز میر، راستہ مت بدل، ص ۲۸)

ہم لوگوں کی رودادِ سفر کون لکھے گا
لکھنا تو ضروری ہے مگر کون لکھے گا

(واحدِ اعجاز میر، راستہ مت بدل، ص ۱۳۲)

کربلا کا اثر:

واقعہ کربلا تاریخ عالم کا ایک ایسا واقعہ ہے جس کو فراموش کرنا تاریخ کے لیے ناممکن ہے۔ یہ ایسی شہادت تھی جس کی مثال دوسری نہیں ملتی کربلا کے اس دردناک اور نہایت کرب ناک واقعے کی اس سے بدترین مثال نہیں ملتی۔حضرت امام حسینؓ کے ساتھ ان کا پورا خاندان ایک قافلے کی صورت شریک تھا۔اس قافلے کا ہر مسافر راہِ حق میں اپنا سب کچھ قربان کر چکنے کے لیے بے تاب تھا۔حضرت حسین ابن علیؓ کی اس اس بے مثال اور لازوال شہادت نے ادبیات پر گہرے نقوش مرتب کیے۔اس واقعے کو خاص صنفِ شعر مرثیے کے علاوہ غزل میں بھی شعرائے اردو نے بہت اچھوتے انداز میں بیان کیا ہے۔کربلا ایک استعارہ بن گیا جس کے حوالے سے گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

''واقعہ کربلا کے تاریخی حوالے کا استعاراتی اظہار غزل کی کلاسیکی روایت میں یقیناً ڈھونڈا جا سکتا ہے اور اس کی تلاشی سعی لاحاصل نہ ہوگی۔''۳۱

واحد اعجاز میرؔ کی غزل کے مطالعے سے اس بات کا ادراک ہوتا ہے کہ ان کے ہاں شہدائے کربلا کی شان میں بہت کچھ لکھا گیا۔کربلا ایک استعارے اور تشبیہ کے طور پر بھی لایا گیا اور اس کو صبر کے معنوں میں بھی استعمال کیا گیا واحد اعجاز میرؔ چوں کہ میرؔ کی روایت کے امیں ہیں اور اپنی خانوادے سے ہیں۔مجالس اور شام غریباں سے بھی ان کی مذہبی وابستگی ہے اس لیے بھی ان کے ہاں کربلا کا درد الگ طرح سے ہے۔مثال کے طور پر:

ان پہ میرا سلام جو کٹ کر
وہیں میدان میں پڑے ہوئے ہیں

(واحد اعجاز میر، آواگون، ص ۲۲۷)

یہاں قاری کے لیے قطعاً یہ سمجھنے میں دقعت نہیں کہ یہ شعر شہدائے کربلا کی عظمت کے اعتراف میں ہے۔ایسے ہی مزید اشعار جن سے واحد اعجاز میرؔ کی کربلا والوں کے لیے عقیدت اور محبت ظاہر ہوتی ہے اس کے علاوہ واحد اعجاز میرؔ کے اوپر کربلا کا اس قدر اثر ہے کہ ان کے اشعار میں کربلا کے مختلف انداز نظر آتے ہیں۔

لبِ فرات پہنچ کر ہوتی خبر مجھ کو
کہ منتظر ہے نئی کربلا، فرات کے بعد

(واحد اعجاز میر، راستہ مت بدل، ص ۶۸)

اشکوں سے وضو کر کے دعا مانگو خدا سے
آئے کوئی عباسؓ کا کردار پیدا کرے

(واحد اعجاز میر، راستہ مت بدل، ص ۱۱۹)

ہر مہینا محرم ہے میرے لیے
ان کا غم ہر مہینے میں زندہ رہے

(واحد اعجاز میر، راستہ مت بدل، ص ۱۴۴)

حسینؓ ان سے ہیں اور وہ حسینؓ سے ہیں تو پھر
میں کیوں نہ کہوں کہ سارے کا سارا دیں ہیں حسینؓ

(واحد اعجاز میر، راستہ مت بدل، ص ۴۵)

اور کوئی ہوتا تو جبر پہ بیعت کر لیتا
سامنے اپنی آنکھوں کے گھر بار لٹاتا کون؟

(واحد اعجاز میر، راستہ مت بدل، ص ۱۵۲)

عشق و محبت:

عشق و محبت کسی بھی شاعر کے ہاں بنیادی چیز ہے۔ اگر کسی ایک موضوع کی بات کریں جس پر اردو شاعری گھومتی ہے تو محبت ہے۔ اس کو اردو شاعری میں سب سے زیادہ دخل رہا ہے۔ محبت کائنات کی بنیادی ضرورت سمجھی جاتی ہے۔ یہی وہ جذبہ ہے جو وجہ تخلیق کائنات بنا۔ محبت اور عشق کی تعریفات کسی نہ کسی پیمانے پر ایک دوسرے سے الگ سہی لیکن عموماً شعرا نے ان کو ایک ہی انداز میں بیان کیا ہے۔ یہ عشق مجازی اور حقیقی پر دو صورتوں میں اردو شاعری کا خاصا ہے۔ عشق و محبت کی وسعت اس قدر ہے کہ مسلسل لکھنے کے بعد بھی آج تک شعرا اس موضوع کو نئے نئے انداز سے نیا کر دیتے ہیں جس کی بنیادی وجہ محبت کا تا حشر جاری رہنے والا عمل ہے۔ واحد اعجاز میرؔ عشق کے داعی ہیں ان کی شاعری محبت کے جذبوں کی حامل ہے ان کے ہاں جذبہ محبت بنیادی اور لافانی ہے۔ احمدؔ حسین مجاہد کے مطابق:

''واحدؔ مستعار تجربات کا دف نہیں بجاتا نہ محبت اس کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ اس پر جو گزرتی ہے وہ اپنے الفاظ میں اسے شدت کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ اس کے شعر کی محض ہلکی آنچ سے بھی پہاڑوں پر سے برف پگھلنے لگتی ہے۔''۳۲

واحد اعجاز میرؔ جب محبت کی کیفیات کو شعری قالب میں ڈھالتے ہیں تو اس کی ندرت اور تازگی ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔

ہم نے یہ آنکھیں تو کیا خواب بھی سونپے تجھ کو
اے محبت مجھے کیا اب بھی خسارہ ہے کوئی

(واحد اعجاز میر، راستہ مت بدل، ص۳۳)

ہم سفر تو نظر عشق کی بارگاہ مقدس پہ رکھ
کٹ گئے پاؤں تو جائیں گے سر کے بل، راستہ مت بدل

(واحد اعجاز میر، راستہ مت بدل، ص۴۵)

آبلہ اک پھوڑ کے نکلے تھے گھر سے
ہم محبت اوڑھ کر نکلے تھے گھر سے

(واحد اعجاز میر، راستہ مت بدل، ص۱۰۳)

واحد اعجاز میرؔ کی شاعری میں عشق و محبت کی کیفیات نئے نئے انداز اور نئے نئے الفاظ کے ساتھ اول تا آخر موجود ہیں۔ وہ عشق کو بارگاہ مقدس اور محبت کو مقام آخر مانتے ہیں۔ واحد اعجاز میرؔ کے ہاں عشق کربلا بھی ہے رب کی رضا بھی ہے، عشق پیاس بھی ہے اور عشق لہو بہانا بھی ان کے ہاں محبت آگ بھی جلنا بھی ہے اور محبت دانت توڑنا بھی ہے۔ محبت یہ بھی ہے کہ بپھری لہروں میں بہا جائے اور محبت یہ بھی ہے کہ پتھر سے سر پھوڑ لیا جائے۔

اُسلوبیاتی جائزہ:

شفقت حسین کے مطابق:

''اُسلوب کی اصطلاح سے عموماً طرزِ تحریر مراد لی جاتی ہے یا یہ سمجھا جاتا ہے کہ فن کار کو زبان پر کہاں تک قدرت حاصل ہے۔۔۔ جس طرح رنگ تصویر ہیں حسن اور خوش بو ماحول

میں نفاست پیدا کرتی ہے۔اسی طرح زبان کا دانش مندانہ استعمال فن کی خوب صورتی کو نمایاں کرتا ہے۔ٹھوس پتھر کے محاسن اس وقت تک نمودار نہیں ہوتے جب تک اس کی مخروطی حفاظت کو کس واضح اسلوب سے نمایاں نہ کیا جائے۔''۳۳

بلاشبہ اسلوب کسی بھی تحریر میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔اردو شاعری کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے اکثر شعرا اپنے خاص اسلوب سے پہچانے گئے۔ہر شاعر نے اپنے ماحول اور حالات سے اثر لے کر اپنا اسلوب بنایا۔ یہاں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اسلوب کے بننے میں کوئی بھی شاعر شعوری کوشش نہیں کرتا۔اس کے حالات اور اس کے پیش نظر عناصر اس کے اسلوب کے بننے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔اسی بنا پر شاعر کا اسلوب اس کے لاشعور کے نتیجے میں واضح ہو جاتا ہے۔اردو شاعری میں کئی شعرا کے ہاں بعض الفاظ،بعض واقعات،بعض علامات ان کے خاص اسلوب کی پہچان بن گئے۔واحد اعجاز میرؔ نے جس ماحول میں جنم لیا اس ماحول نے ان کے اسلوب میں اہم کردار ادا کیا۔بنیادی طور پر انگریزی کے طالب علم ہونے کے باوجود وہ اردو شاعری کی طرف آئے تاہم ان کے ہاں انگریزی کے کچھ الفاظ کا خاص استعمال ان کے اسلوب کا حصہ بن گیا ہے۔یہ انگریزی الفاظ انھوں نے وہی استعمال کیے جو ہمارے ہاں مستعمل ہیں۔ واحد اعجاز میرؔ نے جن الفاظ کا استعمال کیا وہ نفاست استعمال کی وجہ سے برمحل لگتے ہیں۔

یہ بھی ممکن ہے سمندر مجھے رستہ دے دیں
تم مرے بھیجے ہوئے کارڈ جلا مت دینا

(واحد اعجاز میر،راستہ مت بدل،ص۵۱)

پھر کیا ہے جو حبس بہت ہے جلتا ہے فٹ پاتھ
مجھ کو اپنے خواب پہن کر، سونا آتا ہے

(واحد اعجاز میر،راستہ مت بدل،ص۶۸)

بینچ پر میں اداسی لپیٹے ہوئے بیٹھا رہ جاؤں گا
شام ڈھلتے ہی تو اپنے گھر جائے گا، میں نے سوچا نہ تھا

(واحد اعجاز میر،راستہ مت بدل،ص۹۳)

واحد اعجاز میرؔ کے ان اشعار میں کارڈ، فٹ پاتھ، بینچ مثالیں ہیں انہی کے ہاں انگریزی الفاظ کے استعمال کی۔ انھوں نے اپنے اسلوب میں کچھ دیگر الفاظ کا استعمال بھی کثرت سے کیا ہے وہ الفاظ گو کہ اردو ہی کے مستعمل الفاظ ہیں تاہم ان الفاظ کو ان کے کلام میں بار بار دیکھا جا سکتا ہے۔ مثلاً ''دیمک'' کا لفظ واحد اعجاز میرؔ کے ہاں کثرت استعمال کے باعث ان کے خاص اسلوب کا حصہ لگتا ہے۔

دیمک جیسے غم آئیں گے رات ڈھلے
گھر کی اک اک چیز پرانی کر جائیں گے

(واحد اعجاز میر، راستہ مت بدل، ص ۴۷)

میں تیرا بوجھ اٹھانے کا کہہ رہا ہوں مگر
مری نہ مان، کہ دیمک لگی ہوتی ہے مجھے

(واحد اعجاز میر، راستہ مت بدل، ص ۵۷)

اس غزل کی ردیف ہیں ''کہ دیمک لگی ہوئی ہے مجھے'' ہے اس بابت احمد عطاؔ اللہ کہتے ہیں۔

''واحد اعجاز میرؔ کے ہاں دیمک کا استعمال اس طرح ہے کہ اب دیگر شعرا کو محتاط رہ کر چلنا پڑے گا۔ یہ دیمک لفظ انھوں نے اس نفاست سے استعمال کیا ہے کہ شعرا کے ہاں یہ لفظ غیر ارادی طور پر آ سکتا ہے۔''۳۴

بے یقینی کی دیمک ہے دل کو لگی، التجا کیا کرے اور خدا کیا کرے
ایک آنسو ہتھیلی پہ گرتا نہیں، سو دعا کیا کرے اور خدا کیا کرے

(واحد اعجاز میر، راستہ مت بدل، ص ۱۱۷)

واحد اعجاز میرؔ نے اپنے اسلوب کو بنانے میں جو مشقت اٹھائی وہ ان کے کلام سے ظاہر ہوتی ہے۔ انھوں نے اکثر شعرا کے مضامین کو بھی اپنے ہاں تحریف کر کے پیش کیا ہے۔ جس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی سخن پر نظر رہی ہے۔ واحد اعجاز میرؔ کے ہاں واردات قلبی اپنے آپ میں کئی شاعرانہ تیور اور اچھوتے انداز لیے ہوئے ہیں۔ منفرد اور اچھوتی ردیفیں بھی واحد اعجاز میرؔ کے خاص اسلوب کی پہچان بن گئی ہیں۔ ان کی شاعری میں قاری سے ایک خیال کا رشتہ

نظر آتا ہے۔ جو قاری کے ذہن پر بے ساختہ دستک دے کر اس کے ذہن کے راستے دل میں اتر جاتی ہے۔ واحد اعجاز میؔر کے ہاں کسی کی زمین کا استعمال تو نہیں ملتا تاہم ان کے کلام سے ایسے اشعار دیکھیے جن میں جوؔن ایلیا کا رنگ نظر آتا ہے۔

چار سو مہکے گلابوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا
میرے اندر مرے خوابوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا

(واحد اعجاز میر، راستہ مت بدل، ص ۱۱۷)

دل تو چارہا بھرا بازار خریدوں لیکن
مرے ہاتھوں میں کتابوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا

(واحد اعجاز میر، راستہ مت بدل، ص ۷۵)

درجہ بالا شعروں میں جون کی نظم ''رمز'' کا پرتو دیکھا جاسکتا ہے۔

واحد اعجاز میؔر کے کلام کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مختلف قسم کے رویوں اور ملے جلے اثرات سے بہت کم متاثر ہوئے۔ ان کا مطالعہ تو یقیناً ان کے کلام میں موجود ہے۔ لیکن وہ کسی دوسرے شاعر سے متاثر ہوئے ایسا نہیں دکھائی دیتا۔ تاہم میؔر کے خانوادے سے ان کو نسبت جو تھی وہ اسے اپنے لیے باعث عزت وتوقیر سمجھتے ہیں۔

میؔر کے نام کی نسبت بھی بڑی ہے یارو
ہم فقیروں کو یہ عزت بھی بڑی ہے یارو

(واحد اعجاز میر، راستہ مت بدل، ص ۴۵)

واحد اعجاز میؔر نے اپنے لیے شاعری میں الگ شناخت اور لہجہ بنایا ہے وہ اپنے کلام کے اندر ایک مثبت رویے کا پتا دیتے ہیں اور ان کا کلام ندرت اور جدت لیے ہوئے قاری کو متاثر کرتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ مقالہ نگار کا سیدہ آمنہ بہار سے انٹرویو،۱۴،نومبر ۲۰۱۶ء، بمقام مظفرآباد۔

۲۔ محمد کبیر خان، تواپرات اور شاعری، روزنامہ نوائے وقت، راول پنڈی،۱۹ اکتوبر ۱۹۸۹ء۔

۳۔ محمد حسین آزاد، نظم آزاد، مفید عام پریس، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۳۔

۴۔ سیدہ آمنہ بہار، (مشمولہ دومیل)، مجلّہ گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج، مظفرآباد، ۲۰۱۴ء، ص ۱۱۱۔

۵۔ پروفیسر مسرت صبوحی، کشمیر میں مزاحمتی ادب، علی پرنٹرز، میر پور، ۲۰۱۴، ص ۶۵۔

۶۔ فنون، سہ ماہی، لاہور، جون تا دسمبر ۱۹۹۷ء، ص ۱۱۸۔

۷۔ ناصر زیدی (دیباچہ)، چناروں کی آگ، سیدہ آمنہ بہار، ص ۱۰۔

۸۔ سید سبط احمد (فلیپ) چناروں کی آگ، سیدہ آمنہ بہار۔

۹۔ عطاالحق قاسمی، اپنے گیتوں کی لے تیز رکھنا، روزنامہ نوائے وقت، لاہور، ۲۰ جولائی ۱۹۸۹ء۔

۱۰۔ فنون، لاہور، شمارہ ۵۰، جون تا دسمبر ۱۹۹۷ء، ۱۱۸۔

۱۱۔ فنون، لاہور، شمارہ ۱۱۷، اپریل تا اگست ۲۰۰۲ء، ۱۴۹۔

۱۲۔ اختر امان، آزاد کشمیر کی ممتاز شاعرہ، نوائے وقت، روزنامہ، راولپنڈی، ۲۷، اگست ۱۹۸۹ء۔

۱۳۔ فنون، لاہور، شمارہ ۱۱۵، دسمبر تا جنوری ۲۰۰۱ء، ۱۱۳۔

۱۴۔ اعتبار ساجد (مقدمہ)، چناروں کی آگ، سیدہ آمنہ بہار، ص ۱۱۔

۱۵۔ افتخار مغل سے فرہاد شاہ کا انٹرویو، جموں کشمیر، روزنامہ، راولپنڈی، ۴ نومبر ۲۰۰۶ء۔

۱۶۔ خان زمان مرزا، پروفیسر (مقدمہ)، لہو لہو کشمیر، افتخار مغل، ص ۸۔

۱۷۔ آمنہ بہار، وطن جواں کے فکر و فن کا استعارہ ہے (دیباچہ)، لہو لہو کشمیر، ص ۹۔

۱۸۔ احمد ندیم قاسمی، پیش گفتار (دیباچہ)، انکشاف، افتخار مغل، ص ۱۲۔

۱۹۔ ایم یامین، (مقدمہ)، لہو لہو کشمیر، افتخار مغل، ص ۱۳۔

۲۰۔ احمد وقار، افتخار مغل کی غزل (مشمولہ)، سیاست، روزنامہ، مظفرآباد، ۳۱ جولائی ۲۰۱۷ء۔

۲۱۔ ایضاً۔

۲۲۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، تنقیدی اصلاحات، سنگ میل پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۱، ص ۴۷،۔

۲۳۔ احمد وقار، افتخار مغل کی غزل (مشمولہ)، سیاست، روزنامہ، مظفرآباد، ۳۱ جولائی ۲۰۱۷ء۔

۲۴۔ محمد ہادی حسین، مغربی شعریات، مجلس ترقی ادب، لاہور، طبع سوم ۲۰۱۰ء، ص ۱۹۴۔

۲۵۔ احمد وقار، افتخار مغل کی غزل (مشمولہ)، سیاست، روزنامہ، مظفرآباد، ۳۱ جولائی ۲۰۱۷ء۔

۲۶۔ مقالہ نگار کا واحد اِعجاز میر سے انٹرویو، بتاریخ ۲۷ جولائی ۲۰۱۷ء، بمقام مظفرآباد۔

۲۷۔ احمد ندیم قاسمی کا خط بنام واحد اِعجاز میر، ۲۵ مئی ۲۰۰۲ء۔

۲۸۔ انیس ناگی، شعری لسانیات، فیروزسنز، لاہور، ۱۹۹۰، اول، ص ۷۱۔

۲۹۔ مقالہ نگار کی پروفیسر اعجاز نعمانی سے گفتگو، ۲۰ جولائی ۲۰۱۷ء، مظفرآباد۔

۳۰۔ سعداللہ شاہ، (دیباچہ)، راستہ مت بدل، واحد اِعجاز میر، ص ۱۵۹۔

۳۱۔ گوپی چند نارنگ، سانحہ کربلا بہ طور شعری استعارہ، سنگ میں پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۲۵۔

۳۲۔ احمد حسین مجاہد، مسافر خواب (دیباچہ)، واحد اعجاز میر، راستہ مت بدل، ص ۱۵۔

۳۴۔ شفقت حسین، اسلوب کا مسئلہ، مشمولہ، اوراق، لاہور، شمارہ خاص ۲، جلد ۲، ۱۹۶۷ء، ص ۷۱۔

۳۵۔ مقالہ نگار کا احمد عطاء اللہ سے انٹرویو، بتاریخ ۳۰ جولائی ۲۰۱۴ء بمقام مظفرآباد۔

باب چہارم

آزاد کشمیر کے منتخب شعرا کی غزل کا باہم تقابل

آزاد کشمیر کے غزل گوشعرا کے ہاں زبان و بیاں، اسلوب، فکر اور فن کے حوالے کئی طرح کے اختراکات اور اشراکات پائے جاتے ہیں۔آزاد کشمیر کے منتخب غزل گوشعرا کے ہاں یہاں ہم تقابل کرتے ہیں جس سے یہ بات سمجھنے میں آسانی رہے گی کہ ان شعرا کے ہاں فنی یا فکری اور اسلوبیاتی سطح پر کیا کیا چیزیں مشترک ہیں اس کیا کیا مختلف ہیں؟

اشتراکات فکری اعتبار سے

فکری اعتبار سے اگر ہم دیکھیں تو آزاد کشمیر کے سبھی شعرا کے ہاں کئی فکری جہتیں ایک جیسی ہیں۔مثال کے طور پر یہاں کے سبھی شعرا کے ہاں قریب قریب ترقی پسندی کی حامل فکر ملتی ہے۔آزاد کشمیر کے شعرا کی شاعری کا محور وہ انسان ہے جو غلامی اور جبر کی زنجیروں میں جکڑا ہوا اور ان زنجیروں کو توڑ کر سماج میں ایک انقلاب کا خواہاں ہے۔وہ اس بات کا خواہاں ہے کہ اس کی ذات کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے۔آزاد کشمیر کے ان شعرا کے ہاں انسانی سماج کی ایسی عکاسی ملتی ہے جس میں انسانوں کی بھاری اکثریت صدیوں کے ظلم و ستم اور بے جا استحصال پر مبنی طبقاتی نظام حیات میں اپنی زندگی کے دن بسر کرنے پر مجبور ہیں وہ بے بسی اور غلامی کی گونا گوں زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔صابرؔ آفاقی کی شاعری میں آفاقیت، بین الاوامیت، امن اور انسان دوستی کے سوتے پھوٹتے ہوئے نظر آتے ہیں۔زاہدؔ کلیم اور الطافؔ قریشی بھی کرہ ارض کے بے بس اور مجبور انسانوں کی حالت زار پر نوحہ کناں ہیں۔افتخارؔ مغل اور آمنہؔ بہار کے ساتھ ساتھ واحد اعجاز میرؔ بھی اپنے گردو پیش کے ان دل دہلا دینے والے مناظر کو فراموش نہیں کر سکتے۔ترقی پسندی ایک بین الاقوامی تحریک نہ صرف تھی بل کہ آج بھی اس کے ماننے اور قبول کرنے والے موجود ہیں۔یہ تحریک کسی ایک آدمی کی بنائی ہوئی نہیں نہ ہی اس کے آغاز کو کسی خاص عہد یا زمانے سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔قطع نظر اس کے کہ اردو ادب میں ۱۹۳۶ء میں اس تحریک نے قدم رکھا۔ انسانیت کی تاریخ کا باب اول بھی ترقی پسند سے ہی شروع ہوتا ہے۔ جہاں ظالم کے مقابلے مظلوم کا ساتھ دینے والے موجود تھے ترقی پسندی نام ہے تبدیلی اور ارتقا کا جیسا کہ عشرتؔ رومانی لکھتے ہیں۔

''ترقی پسند تحریک اپنے عہد کی سب سے عظیم تحریک تھی جس نے طبقات کی نفرت کی بہ

جائے عوام کو محبت کے نغمے سنائے۔ نئے ادب کی تعمیر کے لیے راہ ہموار کی۔ ترقی پسند تحریک کے پیش نظر اعلیٰ سماجی مقاصد تھے جن کی بنیاد عظیم انسانی آدرشوں پر تھی جن سے انھوں نے کسب نور کرنے کی کوشش کی۔ امن، محبت قوموں میں دوستانہ تعلقات انسان دوستی اور جنگ سے نفرت کا اظہار کیا گیا۔ ادب کے یہ عظیم اخلاقی مقاصد تھے جن کے ذریعے عوامی ادب اور کلچر کے مستقبل کے لیے معتبر ہاتھوں کو یہ فرض سونپ دیا گیا۔''[۱]

یہی فکر، یہی امن ومحبت کا احساس ہمارے شعرا کے زہنوں کو دستک دے کر ان کے دماغ میں پیوست ہو گیا۔ انھوں نے پھر قلم جو اٹھایا تو اس قلم سے روشنائی محبت کی نغموں کی صورت اخراج کرنے لگی۔ یہ نغمے اس طبقے کی حمایت میں تھے جس کو معاشرتی اور طبقاتی تقسیم میں ایک خط سے نیچے سمجھا جاتا تھا۔

افتخار مغل نے چوں کہ احمد ندیم قاسمی کے ساتھ مضبوط تعلق قائم کر رکھا تھا اور زاہد کلیم، جوش ملیح آبادی کے شاگرد ہیں۔ دیگر شعرا کے ہاں بھی ترقی پسند سوچ یوں ملتی ہے کہ فیض احمد فیض اور احمد فراز جیسے شعرا آزاد کشمیر میں آ کر مشاعرے پڑھتے اور یہاں کے شعرا کے لیے مشعل راہ بنتے تھے۔ ان تمام وجوہات کی بنا پر آزاد کشمیر کے شعرا کے ہاں ترقی پسند سوچ مزید نکھر کر سامنے آتی۔ ان شعرا کے ہاں یہ سوچ ان کے اشعار میں بہ آسانی دیکھی جاسکتی ہے۔

انسان چاند پہ جا پہنچا ہے
ناچتا ہے دھرتی پہ شیطان

(الطاف قریشی، شہر زندگی، ص۲۴)

یہ موت کی دہشت سے لرزتی مخلوق
اے مونس حضرت یزداں، توبہ

(زاہد کلیم، نغمی تار حیات، ص۱۵٦)

سمجھو تو یہی دورِ مساوات بہتر ہے
انسان کی تفریق من و تو میں نہ رکھنا

(صابر آفاقی، سارے جہاں کا درد، ص٦۴)

کچھ لوگ ایسے درد بلط تھے کہ الحفیظ!
بستی میں اک ہوائے جفا وہ چلی کہ بس

(افتخار مغل، انکشاف، ص۲۲۷)

بے مہری کی برف میں ڈوبے موسم آخر
کوئی بتائے کیسے بتائے جس سکتے ہیں

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ، ص۴۳)

مری پہچان میری موت ہو گی
مجھے بے رنگ و بو اپنا پڑے گا

(واحد اعجاز میر، آواگون، ص۵۵)

آزادیٔ کشمیر

آزاد کشمیر کے کسی بھی شاعر کے ہاں اگر دیکھیں تو یہ فکر مشترکہ دکھائی دیتی ہے۔ کبھی شعرا کشمیر سے نہ صرف بے لوث عقیدت اور محبت رکھتے ہیں بل کہ ان تمام کے ہاں شعری واردات میں کشمیر بنیادی موضوع بن گیا ہے۔ آمنہ بہار کا پہلا مجموعہ ''چناروں کی آگ'' اور افتخار مغل کا پہلا مجموعہ ''لہو کشمیر'' کے علاوہ صابر آفاقی کا مجموعہ ''گل ہائے کشمیر'' واضح اشارے ہیں کہ ان شعرا نے اپنی دھرتی کے دکھ کو کیسے محسوس کیا؟ کشمیری قوم غلامی کی اس سیاہ رات کی جلد سحر کے لیے پر امید ہے وہ اس بات پر یقین رکھتی ہے کہ جلد یہ سیاہ رات ایک پر نور صبح میں بدلے گی۔ ڈاکٹر عبدالکریم کے مطابق:

> ''کوئی بھی قوم ہمیشہ غلام نہیں رہتی۔ بل کہ ایک دن غلامی کا جوتا اتار پھینکنے کے لیے میدان میں اترتی ہے اور جب کشمیری میدان میں اترے تھو انھوں نے اپنے وطن کا ایک بڑا حصہ پنجۂ استبداد سے آزاد کروالیا۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے۔ جب غلام ظن وتخمین چھوڑ کر خدا پر بھروسا کرتا ہے۔ اپنے اندر یقین کامل پیدا کرتا ہے اور عشق وجنوں کا سہارا لیتا ہے۔ آزادی کے لیے قوموں کو صدیوں جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔ کشمیریوں کی حالیہ تاریخ بتاتی ہے کہ انھوں نے پرامن جدوجہد کے بعد مسلح جدوجہد کا راستہ اختیار کیا تو ساری دنیا اس

مسئلے کے حل کی طرف متوجہ ہوئی۔ جہاد کی اس شمع کو فرزاں رکھا جائے تو یقیناً یہ مسئلہ بھی زندہ رہے جسے گزشتہ ایک صدی سے تو جوان نسل نے اپنے لہو کے دیے سے جلا رکھا ہے۔''۲

تحریک آزادی کشمیر کے اس راستے پر جہاں نوجوانوں نے اپنے لہو سے قندیلیں جلائیں وہیں ہمارے شعرا نے اپنے قلم کو اپنا لہو دے کر ایسے ایسے اشعار تخلیق کیے جو راہ آزادی میں جوش اور ولولے کی علامت بن گئے۔ کشمیر کے سبھی شعرا کے ہاں یہ فکر واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہے جیسا کہ حبیبؔ کیفوی لکھتے ہیں۔

''شاعر آزاد کشمیر کا ہو یا اسے مقبوضہ کشمیر سے تعلق رہا ہو اپنے فردوس گم گشتہ کے نغمے اس کے ہونٹوں پر لہرائے بغیر نہیں رہتے۔''۳

تحریک آزادی کشمیر کی پس منظر میں منتخب شعرائے آزاد کشمیر کے کلام سے مثالیں دیکھیں۔

حصارِ شب کی سیاہی کے برج ٹوٹ گئے
جمال و نور کے سانچے میں ڈھل گئی وادی

(الطاف قریشی، شہر زندگی، ص۲۲)

آؤ اے ہم وطنو! ایک بھی ہو کر دیکھیں
جھگڑا کشمیر کا ممکن ہے حل ہو جائے

(صابرؔ آفاقی، شہر تمنا، ص۱۶۰)

ایک آن میں مرجھاتی ہیں کھلتی کلیاں
آخر معبود، یہ تماشا کیا ہے؟

(زاہد کلیم، نغمہ تار حیات، ص۱۵۳)

جانے کس وقت سے تھا گھات میں مکار عدو
یک بہ یک دستِ جفا کش بڑھا سوئے گلو

(افتخارؔ مغل، لہو لہو کشمیر، ص۴۱)

جن میں آزادی کی خواہش کب سے ہے گرم سفر
برف زاروں کے فروتر سلسلوں کو چوم لوں

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ، ص ۳۷)

خود سے ناراض مگر مٹی سے وابستہ ہیں
ماں سے اس درجہ عقیدت بھی بڑی ہے یارو

(واحد، اعجاز میرؔ، راستہ مت بدل، ص ۱۲۱)

عشق ومحبت

عشق ومحبت اور اردو شاعری ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ اردو شاعری کے آغاز سے لے کر تا حال سبھی شعرا کے ہاں یہ موضوع بنیادی موضوع ہے۔ ہر شاعر کی فکر عشق ومحبت سے لبریز ملتی ہے۔ مولانا حالیؔ کے مطابق:

''جن لوگوں نے اول غزل لکھی ہوگی ضرور ہے کہ انھوں نے عشق ومحبت کے اسباب اور دواعی محض نیچرل اور سیدھے سادے طور پر معشوق کی صورت، حسن و جمال نگاہ اور ناز و انداز وغیرہ کو قرار دیا ہوگا۔''[۴]

آزاد کشمیر کے شعرا کے ہاں عشق ومحبت بنیادی فکر ہے۔ وہ عشق وطن سے بھی ہے اور مجاز سے بھی۔ شعرائے آزاد کشمیر کے ہاں یہ موضوع دل کو موہ لینے والے انداز اور سادہ اور سہل الفاظ میں ملتا ہے لیکن بہ ظاہر سہل اور آسان نظر آنے والے اشعار کے اندر بے پناہ گہرائی اور گیرائی بھی دکھائی دیتی ہے۔ زاہدؔ کلیم کی شاعری ہو یا افتخارؔ مغل کی یا کسی دیگر شاعر کی اس میں عشقیہ کلام اس خوب صورت انداز میں ملے گا کہ قاری سرشاری کی کیفیت سے نکل نہیں پائے گا۔ شعرائے آزاد کشمیر کی شاعری میں یہ احساس بہ درجۂ اتم موجود ہے کہ ان کہ ہاں جو مضامین اترتے ہیں ان میں محبت کا ایسا سحر موجود ہے کہ قاری اس کے حصار میں قید ہو کر رہ جاتا ہے۔ آزاد کشمیر کے منتخب شعرا کے ہاں عشق ومحبت کے حامل اشعار ملاحظہ ہوں:

میں دیکھ تو سکتا ہوں تجھے چھو نہیں سکتا
تو جھیل میں اترے ہوئے منظر کی طرح ہے

(الطاف قریشی، شہر زندگی، ص ۱۸)

بندۂ عشق کو زیبا نہیں شکوہ کرنا
بہ خدا رنج میں راحت نظر آتی ہے مجھے

(صابرؔ آفاقی،شہرتمنا،۲۷)

کب تک ترے دیدار کو ترسیں آنکھیں
کب تک ترے کوچے کے لگاؤں پھیرے

(زاہدکلیم،نغمہ تارحیات،ص۱۵۷)

تمھارا عشق بھی کھینچا، غم جہاں بھی سہا
یہ بوجھ ڈھوئے ہیں میں نے جدا جدا مری دوست

(افتخارؔ مغل،انکشاف،ص۱۲۳)

وہ ایک شخص عارضی مسرتوں میں گم ہوا
ردائے غم کو اوڑھ کر اسے میں ڈھونڈتی رہی

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ،ص۶۸)

روز دو چار سے ملتے ہیں ہم آپس میں
آج کل اتنی محبت بھی بڑی ہے یارو

(واحد اعجاز میرؔ،راستہ مت بدل،ص۱۲۱)

آزاد کشمیر میں مضبوط شعری فضا اس بات کا ثبوت ہے کہ یہاں کے شعرا نے خط وکتابت کے ذریعے یا میل ملاقات کے ذریعے اردو دنیا کے بڑے ناموں سے روابط قائم رکھے۔ ملک کے سبھی ادبی رسائل سے وابستگی رکھی اور کلام کو نکھار دینے میں بہت محنت کی۔ آزاد کشمیر کے منتخب شعرا کے ہاں تشبیہات اور استعارات کا ستعمال دیکھیں کہ کس طرح انھوں نے علم بیاں کے ان نگینوں کو اپنی شاعری میں جوڑا ہے؟

وہ بھی کل رات بجھ گیا الطافؔ

جس ستارے سے اپنی یاری تھی

(الطاف قریشی، شہر زندگی، ص ۲۶)

یہ مقناطیسی سی دل کی کشش تنہا نہیں رکھتی
کہ جس کو عشق ہو وہ عشق والے ڈھونڈ لاتا ہے

(صابرؔ آفاقی، نئے موسموں کی بشارت، ص ۹۵)

ہاں زعم یہ نہیں ہے حقیقت ہے ہم نفس
میں ایک چراغِ نو تھا بجھایا گیا ہوں میں

(زاہد کلیم، نغمہ تار حیات، ص ۵۰)

ایک مرتبہ خود کو سمیٹ لیں تو چلیں
پھر ایک بار اڑے ہیں غبار کے جیسے

(افتخارؔ مغل، انکشاف، ص ۱۴۱)

مثالِ بادِ صبح نو ، جو آ کے پھر چلا گیا
کہ جاتے جاتے دیر تک اسے میں دیکھتی رہی

(سیدہ آمنہ بہار، سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ، ص ۲۹)

یار دریا! بڑے گھمنڈ میں ہو
تم سمندر کو کاٹ دو گے کیا

(واحد اعجاز میرؔ، راستہ مت بدل، ص ۶۴)

فنی اعتبار سے اشتراکیت

فکر کے ساتھ ساتھ آزاد کشمیر کے منتخب غزل تو شعرا کے ہاں فنی اعتبار سے بھی کچھ مماثلت موجود ہے۔ شعر کے حوالے سے ناقدین کی رائے یہ ہے کہ یہ ایک نازک فن ہے۔ اس میں لفظوں کا الٹ پھیر شاعری کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ شعر مجموعہ ہے خیال کا، فکر کا اور الفاظ کا اس میں جہاں شاعر کا تخیل کارفرما ہوتا ہے وہیں زبان و بیان بھی بہت اہم تصور

کیا جاتا ہے۔کوئی بھی شاعر اعلیٰ شاعری تخلیق کر سکتا ہے جب وہ اس فن سے آشنا ہو،محاورات و استعارات وتشبیہات کا برمحل استعمال جانتا ہو۔شاعری میں استعاراتی زبان شعرا کی فن پر دسترس کا پتا دیتی ہے۔الطاف حسین حالی کے مطابق۔

''استعارہ بلاغت کا ایک رکن اعظم ہے اور شاعری کو اس کے ساتھ وہی نسبت ہے جو قالب کو روح کے ساتھ۔کنایہ اور تمثیل کا حال بھی استعارے ہی کے قریب قریب ہے۔ یہ سب چیزیں شعر میں جان ڈالنے والی ہیں۔جہاں اصل زبان کا قافیہ تنگ ہو جاتا ہے وہاں شاعر انھیں کی مدد سے اپنے دِل کے جذبات اور دقیق خیالات عمدگی کے ساتھ ادا کرتا ہے''۔۵

آزاد کشمیر کے منتخب غزل گو شعرا کے ہاں فنی اعتبار سے مماثلت میں تشبیہات اور استعارات کا استعمال نظر آتا ہے۔ ان شعرا نے اپنے کلام میں حسن،نزاکت اور زورِ بیاں پیدا کرنے کے لیے علم بیاں کے ان قرینوں یعنی تشبیہ اور استعارے سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا ہے۔آزاد کشمیر کے شعرا کو چوں کہ بڑی سطح کے مواقع میسر نہیں آتے لیکن باوجود اس کے انھوں نے اپنے کلام کو وہ دل کشی عطا کی کہ ان کا کلام پاکستان کے کسی بھی شاعر کے مقابلے پر رکھا جا سکتا ہے جس کو مرکز میں رہ کر ہر طرح کے ادبی مواقع میسر آئے۔صابرؔ آفاقی اور الطافؔ قریشی نے بڑا حصہ ریاست سے باہر گزارہ،زاہدؔ کلیم بھی فن کی تلاش میں لاہور میں اور اسلام آباد میں کچھ مدت تک قیام پذیر رہے۔ان شعرا کے ہاں فنی اعتبار سے مماثلت کئی جگہوں پر نظر آتی ہے۔

منظر نگاری

کشمیر کو دنیا میں خوب صورتی کا استعارہ سمجھا جاتا ہے۔دنیا میں اگر کوئی جنت ہے تو وہ کشمیر کو سمجھا جاتا ہے۔کشمیر کی خوب صورتی اور حسن کا زمانہ معترف ہے۔ یہاں کی گیت گاتی ندیاں، فلک بوس پربت، مچلتے جھرنے،سرسبز و شاداب وادیاں دیودار کے گھنے جنگلات،نظروں کو خیرہ کر دینے والی جھیلیں، برف کی سفید چادر اوڑھے بلند و بالا چوٹیاں،طرح طرح کے پھلوں اور پھولوں سے مزین باغات ہر ایک میں قدرت کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔شاذ و نادر ہی کوئی انسان ہوگا جو ان نظاروں سے لطف اندوز نہ ہوا اور اس حسین مصور کہ جس کا یہ شہکار ہے اس کی حمد و ثنا بیان نہ کرے۔بادشاہوں اور مہاراجوں کے لیے پسندیدہ ترین خطہ ارضی یہی کشمیر رہا ہے۔جس دھرتی میں ہر طرح کے موسم ملتے ہوں۔ جہاں کی وادیاں کئی طرح

کے پرندوں کئی طرح کے پرندوں کی مدھر بولیوں سے گنگناتی ہوں۔ جہاں کی صبحیں اور شامیں نرالی اور مدہوش کر دینے والی ہوں بھلا پھر وہاں کے شعرا کیوں فطرت کے ان مظاہر سے غافل رہیں؟ شاعر جو فطرت کا دل دادہ ہوتا ہے اور فطرت سے پیار کرتا اس کے لیے بہت آسان ہوتا ہے۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں اردو شعرا کے ہاں کشمیر کا حسن ایک استعارہ بن گیا۔ غالبؔ نے تو کشمیر کے حسن کو یوں بیان کر دیا۔

میرؔ کے شعر کا احوال کہوں کیا غالبؔ
جس کا دیوان کم از گلشنِ کشمیر نہیں

(مرزا غالب، دیوانِ غالبؔ، ص۳۰۹)

شعرائے آزاد کشمیر نے فطرت کے ان مظاہر کی جو منظر کشی کی ہے وہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ شعرا کے آزاد کشمیر کے ہاں منظر نگاری کا عنصر پوری طرح موجود ہے۔ ان شعرا کے ہاں منظر نگاری کے جو نمونے ملتے ہیں ان میں فطرت کا حسن بھی ہے اور اس دھرتی کے رہنے والوں کے انداز بھی۔ یہاں فطرت کو علامت بنا کر پیش کرنا بھی شعرا کے ہاں مقبول رہا ہے۔ آزاد کشمیر کے ان شعرا کے ہاں کشمیر کے قابلِ دید مقامات جھیل ڈل، نشاط باغ، مکڑا پہاڑ، پیر چناسی، جہلم و نیلم دریا اور اس کے جیسے کئی اہم نام دکھائی دیتے ہیں۔ آزاد کشمیر کے منتخب شعرا کے ہاں منظر نگاری کے حامل اشعار دیکھیں:

دھوپ کی شدت نکل گئی ہے۔ موسموں کی ہریالی
رکا ہوا ہے ڈھلوانوں پر خوش بو کا پھیلاؤ

(الطاف قریشی، داتا زہر پلا، ۲۲)

ہو رہا ہے شب سے برف نقرئی کا پھر نزول
یا چھڑ کتے ہیں فرشتے خاک پر بیلے کے پھول

(صابرؔ آفاقی، صابرؔ آفاقی، شہرِ تمنا، ص۱۲۶)

دامانِ آسماں پہ ستارے چمک گئے

گرنے لگے فضاؤں پہ رنگوں کے آبشار

(زاہد کلیم، نغمہ تار حیات، ص۱۱۳)

رنگ، خوش بو، شفق، چاندنی، شاعری
لکھ رہا تھا میں، اس نے کہا ''اور میں!''

(افتخار مغل، انکشاف، ص۱۲۷)

جن میں آزادی کی خواہش کب سے ہے گرم سفر
برف زادوں کے فروتر سلسلوں کو چوم لوں

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ، ص۳۷)

اپنے زخموں بھرے جسم کو سرخ پھولوں کی ڈالی سمجھ
دیکھتے ہیں ہمیں ڈل میں کھلاتے کنول، راستہ مت بدل

(واحد، اعجاز میر، راستہ مت بدل، ص۴۶)

صنائع بدائع کا استعمال

اگر صنائع بدائع کے حوالے سے شعرا کے آزاد کشمیر کے کلام کا جائزہ لیا جائے تو وہاں بھی ان کے مابین اشتراکیت ملتی ہے۔ مثلاً صنعت تضاد کا استعمال، مراعات النظیر، ترافق کا استعمال سبھی شعرا کے کلام میں موجود ہے۔ صنائع بدائع بھی کلام میں نفاست کے لیے شاعر کے پاس بہترین ہتھیار رہے۔ اس کا استعمال کلام میں حسن و آہنگ پیدا کرتا ہے۔ آزاد کشمیر کے شعرا نے صنائع بدائع کے استعمال میں بھی اپنی چابک دستی دکھائی ہیں۔ گو کہ ان کے ہاں وہ تمام صنعتیں استعمال نہیں ملتیں لیکن جو دستیاب ہیں وہ مکمل اور بھرپور ہیں۔ صنعت تضاد کی اگر بات کریں تو تضاد بہت مقبول ہونے کے ساتھ ساتھ آسان بھی ہے کہ ایک لفظ کی ضد میں دوسرا لفظ استعمال کرنا کوئی مشکل عمل نہیں ہاں یہ بات ضرور ہے کہ اس لفظ کا مناسب جگہ پر استعمال کیا جائے۔ تضاد تمام شعرا کے ہاں متفرق صنعت ہے۔ منتخب شعرائے آزاد کشمیر کے ہاں اس صنعت کے حامل اشعار ملاحظہ ہوں۔

شہرِ غم میں اپنے گاؤں کی تلاش

دھوپ کے صحرا میں چھاؤں کی تلاش

(الطاف قریشی،شہرِ زندگی،ص۱۷)

امیرِ شہر کو کیا کیا گمان نہیں مجھ پر
فقیرِ شہر کہاں کوئی راز رکھتا ہے

(صابر آفاقی ، نئے ،موسموں کی بشارت،ص۱۲۴)

دن کو آہِ سرد لب پر ، رات کو طوفانِ اشک
یہ تلاطم خیز آخر، باد و باراں کس لیے

(زاہد کلیم،نغمۂ تارِ حیات،ص۹۳)

لگتا ہے آپ گاؤں سے آئے ہیں افتخارؔ
شہروں میں تو خلوص کی قلت نہ پوچھیے

(افتخار مغل،انکشاف،ص۲۴۴)

کوئی دور ہو کے بھی
میرے آس پاس ہے

(سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ،ص۴۵)

یہ دِل کا شہر ہے اس کی ہوا نرالی ہے
اجڑ رہا ہو تو بستا دکھائی دے گا تمھیں

(واحد اعجاز میر،راستہ مت بدل،ص۱۲۸)

حوالہ جات

۱۔ عشرت رومانی، فکروفن کے نئے زاویے اور شاعری کا سفر، رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۱۲ء، ص ۸۷۔

۲۔ عبدالکریم خان، اقبال کا اُردو کلام اور کشمیر، مشمولہ، دومیل، علمی وادبی مجلّہ، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج مظفرآباد، اپریل ۲۰۱۲ء، ص ۱۵۵۔

۳۔ حبیب کیفوی، کشمیر میں اُردو، اُردو سائنس بورڈ، لاہور، ۱۹۶۹ء، ص ۲۲۷۔

۴۔ الطاف حسین حالی، مقدمہ شعروشاعری، عبداللہ اکیڈمی لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۹۷۔

۵۔ ایضاً، ص ۱۲۵۔

باب پنجم

مجموعی جائزہ،نتائج،تجاویز وسفارشات

۱) مجموعی جائزہ

آزاد کشمیر کے شعرااور ادبا اردو دنیا میں ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ یہاں کے شعرا کے موضوعات میں وسعت، زبان کا بہترین استعمال کے علاوہ فنی اور فکری سطح پر خاصی مضبوطی ہے۔الطاف قریشی آزاد کشمیر سے تعلق رکھنے والے ایک اہم شاعر ہیں۔ان کے کلام میں ہر طرح کے موضوعات کے ساتھ ساتھ فنی اعتبار سے بھی خاصا تنوع نظر آتا ہے۔الطاف قریشی نے اپنی ادبی زندگی میں نہ صرف شاعری کی بل کہ نثر پر بھی طبع آزمائی کی۔اردو کے علاوہ پنجابی زبان پر کمال دسترس رکھتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ الطاف قریشی کا پنجابی کلام بھی ہر اعتبار سے عمدہ اور بہترین ہے۔الطاف قریشی کے کلام میں جو ایک واضح تاثر ملتا ہے وہ ان کا موضوعاتی پھیلاؤ ہے۔ہم دیکھتے ہیں کہ الطاف قریشی کے ہاں مضامین کی رنگا رنگی،تنوع،وسعت اور گیرائی سبھی کچھ موجود ہے۔ان کی غزل میں زندگی سے محبت ،موت کا خوف، دوہرا رویہ، وطن سے محبت اور معاشرتی بے راہ روی کے ساتھ ساتھ معاشرے کی بے حسی بھی ملتی ہے۔

الطاف قریشی کی غزل کے اندر علامات کے استعمال پر بھی خاص توجہ دی گئی ہے۔قاری جب علامات پر غور کرتا ہے تو الطاف قریشی کی علامات انفرادیت کی حامل نظر آتی ہیں۔الطاف قریشی نے غزل کے مزاج کو سمجھتے ہوئے ان علامات کا استعمال کیا ہے۔علامات کو سلیقے سے استعمال کرنا ایک مشکل فن ہے لیکن الطاف قریشی نے اس مشکل فن کو بڑی آسانی کے ساتھ نبھایا ہے۔پیڑ، پرندہ، سایہ، روشنی، گاؤں،شہر،قبر،آنسو،اور دستک وغیرہ الطاف قریشی کے ہاں استعمال ہونے والی چند اہم علامات ہیں۔علامات گو کہ فن کے اظہار کا وسیلہ ہوتی ہیں لیکن اس فن پر عبور بھی ضروری ہے۔الطاف قریشی کے ہاں پرندے کی علامت ہجرت سے عبارت ہے پرندے چوں کہ ہجرت کرتے ہیں اور کشمیری مسلمان بھی ہجرت کے کرب سے گزرے ہیں۔الطاف قریشی کے ہاں ہجرت ایسے ہی ایک اذیت ہے جیسے ناصر کاظمی یا منٹو کے ہاں۔الطاف قریشی نے گاؤں کی علامت کو محبت کے طور پر استعمال کیا ہے، گاؤں چوں کہ خلوص کی علامت ہے۔گاؤں کے لوگ ایک دوسرے سے الفت اور محبت کے لیے جانے جاتے ہیں ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں جب کہ شہروں میں یہ خلوص کم

ہوتا ہے۔ الطاف قریشی شہروں میں نفسانفسی اور منافقت جب کہ گاؤں میں نیک نیتی دیکھتے ہیں۔

علامات کے علاوہ الطاف قریشی کے ہاں تشبیہات واستعارات کا استعمال بھی عمدہ اور بہترین طریقے سے کیا گیا ہے۔ انھوں نے اپنے کلام کو فنی اعتبار سے بھی داغ دار نہیں ہونے دیا۔ الطاف قریشی نے تمام فنی پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے شاعری سے وفا کی۔ ان کے ہاں صنعتوں کا خوب صورت استعمال بھی ان کے کلام کی فنی مضبوطی کا بین ثبوت ہے۔ علاوہ ازیں الطاف قریشی نے غزل میں تجربات بھی برتے ہیں اگرچہ یہ تجربات اُردو شاعری میں نئے تو نہیں تاہم الطاف قریشی نے ان کو نیا کر کے دکھایا۔ کشمیر کے ادبی منظرنامے میں الطاف قریشی نے یہ تجربات کر کے انفرادیت کا ثبوت دیا۔

الطاف قریشی کے صاحب اسلوب شاعر ہونے میں بھی کچھ شبہ نہیں انھوں نے لفظیات کا خوب صورت استعمال کیا۔ الطاف قریشی کے لفظیات میں الفاظ وتراکیب کا کوئی بڑا اختراع تو نظر نہیں آتا لیکن پھر بھی انھوں نے اس کو برتنے میں سبھاؤ اور سلیقے کا مظاہرہ کیا ہے۔ انھوں نے اپنے لیے جس اسلوب کا انتخاب کیا وہ آزاد کشمیر کے ادبی ماحول میں جداگانہ ہے۔ الطاف قریشی کے غزلیں یا ان کا کلام اپنی انفرادیت کے باعث الگ پہچان رکھتا ہے۔

زاہد کلیم آزاد کشمیر کے ایک اہم شاعر ہیں ان کے والد محمد خان نشتر بھی اُردو کے معروف شاعر تھے۔ زاہد کلیم کی غزل کے حوالے سے پروفیسر عبدالکریم رقم طراز ہیں۔

> ''انھوں نے زندگی کے سارے رنگ اپنی غزلوں میں پرو دیے ہیں۔ تاہم زاہد کی غزل روایتی لب ورخسار کے قصوں میں کھوئی نہیں بلکہ اس محبت کے ذریعے زندگی کا ترفع کر لیتی ہے''۔[1]

زاہد کلیم کے ہاں فکری سطح پر تنوع موجود ہے جس میں وارداتِ حسن وعشق کے علاوہ عارفانہ، صوفیانہ وفلسفیانہ مضامین، فلسفہ غم، انسانیت سے محبت، انقلاب کے تصورات وغیرہ نمایاں طور پر ملتے ہیں۔ زاہد کلیم کی غزل کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ اس میں انسانی جذبات واحوال محبت کے موضوعات کس قدر نمایاں ہیں۔ انھوں نے اپنی غزل کو لفظی بناوٹ سے محفوظ رکھتے ہوئے اُسے معنوی اعتبار سے مضبوط بنایا ہے۔ زاہد کلیم چوں کہ قریب دس سال تک جوش ملیح آبادی کی شاگردگی میں رہے۔ یہی وجہ ہے کہ زبان کے استعمال پر انھیں کبھی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ زاہد کلیم کی غزل سے ذہن، ذوق اور زبان سبھی سیراب ہوتے ہیں انھوں نے کسی بھی سطح پر اپنے قاری کو بوریت محسوس نہیں ہونے دی۔ زاہد کلیم کی روشن

خیالی کوبھی جانچنے کے لیےاُن کے غزلیات کا مطالعہ سودمند ثابت ہوسکتا ہے۔زاہدکلیم نے غزل کے لیے جن موضوعات کا انتخاب کیا اُن میں صوفیانہ مضامین،فلسفیانہ انداز اور عارفانہ خیالات کے ساتھ ساتھ کئی متفرق پہلونمایاں ہیں۔

زاہدکلیم زندگی کے ٹھوس حقائق کو سامنے لانے میں بھی ملکہ رکھتے ہیں۔ ان کے ہاں سادگی وسلاست سے وہ حقیقتیں بیان کی گئی ہیں جن کا زندگی سے گہرا رشتہ ہے۔زاہدکلیم کے کلام میں انسانی زندگی کے مسائل کو بہ طریقا احسنم اجاگر کیا گیا ہے۔وہ مقام انسانیت کو پہچاننے میں اپنے قاری کو بھرپور مدد فراہم کرتے ہیں۔انسان جو فطری طور پر حریص ہےاوراسی حرص کے باعث تاعمر مسائل سے دوچار رہتا ہےشاعران پہلوؤں کو نہ صرف محسوس کرتا ہے بلکہ اپنے خاص انداز میں تفہیم بھی کرتا ہےاورلفظوں کا لبادہ پہنا کرقاری کے سامنے لے آتا ہے۔زاہدکلیم کے ہاں ان کی بےساختگی بھی ان کے کلام کی اہم خوبی ہے۔

فلسفیانہ موضوعات اور عارفانہ خیالات زاہدکلیم کی شاعری کا خاصا ہیں۔عموماً یہ سمجھا جاتا رہا ہے کہ عشقیہ اوررخسارو کاکل پرمبنی اشعار ہی اُردوغزل کا لازم جزو ہیں لیکن زاہدکلیم نے اس خیال کی نفی اپنے اس کلام کے ذریعے کی جوصوفیانہ اور فلسفیانہ موضوعات کا حامل ہے۔

زاہدکلیم کی غزل میں حیات وکائنات کے بارے میں جاننے کی تمنا کی حامل ہے۔انھوں نے کہیں بھی عظمت انسان کواپنے کلام سے محو نہیں ہونے دیا۔ان کے کلام میں جوتصورات موجود ہیں اُن کا تعلق حقیقت سے ہے نہ کہ مجاز سے۔

زاہدکلیم کے ہاں فکری سطح بہت مضبوط دکھائی دیتی ہےعلاوہ ازیں ان کا فن بھی بام عروج پر ملتا ہے۔زاہدکلیم نے صنعتوں کا خوب صورت استعمال کیا ہے۔ان کے ہاں زبان بہت صاف اور عمدہ ہے۔زاہدکلیم کے کلام میں حالی اور جوش کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔انھوں نے جس زبان کا استعمال کیا وہ بلاشبہ ٹکسالی زبان کہلاتی ہے۔زاہدکلیم نے فارسیت اور عربیت کا جواستعمال کیا وہ بھی ان کے کلام کی خاص پہچان ہے۔مشکل زبان زاہدکلیم کو پسند ہے۔وہ اپنی غزل کے لیے ایسی زبان استعمال کرتے ہیں جو غالب اور اقبال کے ہاں ملتی ہے۔

زاہدکلیم ایسے شاعر ہیں جن کے ہاں زندگی کے بارے میں ایک اثباتی نقطہ نظر موجود ہے۔وہ مایوس ہونے کی بہ جائے اُمید کا دامن تھامے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔نامساعد حالات کے باوجودان کی زندگی میں رجائیت موجود ہے۔زاہد کلیم ہر غم سے نبردآزما ہونا بہ خوبی جانتے ہیں۔زاہدکلیم کی غزل اداس ماحول میں خوش گوار احساس کا نام ہے۔وہ ایک ایسے

شاعر ہیں جن کا کلام قاری کو مایوسی کے لمحات میں اُمید کی کرن دکھاتا ہے۔ زاہد کلیم کی غزل کا مطالعہ کرنے کے بعد قاری ایک بحرِ بے کراں میں خود کو محسوس کرتا ہے۔ قاری کے لیے ایک پرلطف ماحول اور تسکین کے ساتھ ساتھ زاہد کلیم کی غزل حظ کا سامان بھی مہیا کرتی ہے۔

صابر آفاقی کے کلام میں بھی تمام تر رعنائیاں موجود ہیں۔ صابر آفاقی آزاد کشمیر کے ایسے شاعر ہیں جن کے ہاں لفظی پیکر تراشی کے علاوہ عمدہ اسلوب موجود ہے۔ ڈاکٹر صابر آفاقی شاعر، محقق، نقاد اور مورخ ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین اُستاد بھی تھے۔ انے کے کلام میں بھی بے شمار خصوصیات موجود ہیں۔ صابر آفاقی محبت کے شاعر تھے وہ امن کے متلاشی اور انسانی اقدار کے حامل تھے جیسا کہ حکیم محمد سعید رقم طراز ہیں۔

> ''چوں کہ اُن کی شاعری کی اساس کلیتہً محبت پر ہے اس لیے اس میں امن سے محبت، وطن سے محبت، انسانیت سے محبت اور محبوب سے محبت کے بہت سے گوشے جگ مگ کرتے دکھائی دیتے ہیں''۔۲

ڈاکٹر صابر آفاقی کے ہاں اگر مزاح نگاری کو دیکھا جائے تو وہ ایک بھرپور مزاح نگار کے روپ میں ملتے ہیں۔ اگر ان کے ہاں سنجیدہ شاعری پر نگاہ ڈالیں تو وہ وہاں بھی مکمل شاعر نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر صابر آفاقی کے ہاں مقامی الفاظ کا استعمال بھی موجود ہے اور مختلف علاقوں کا تذکرہ بھی۔ ڈاکٹڑ صابر آفاقی کے کلام میں حب الوطنی بھی موجود ہے اور انسان دوستی بھی۔ وہ ایک دردمند دِل رکھنے والے انسان تھے کسی کا دکھ دیکھتے تو اُس پر پریشان ہوجاتے۔ صابر آفاقی امن کے داعی تھے وہ جنگ وجدل کے مخالف تھے۔ ان کا کلام جہاں فکری اعتبار نظر نہیں آتا۔ ڈاکٹر صابر آفاقی کی غزل عشق ومحبت کے جذبات سے لبریز ہے۔ وہ اپنی مٹی سے محبت کرتے ہیں وہ اپنے ملک سے محبت کرتے ہیں، وہ اپنے ہم وطنوں سے محبت کرتے ہیں اور وہ محبت کرتے ہیں ہر مظلوم انسان سے۔ صابر آفاقی کی غزل میں جامعیت بھی ہے اور وسعت بھی ان کا کلام دریا کی روانی کی طرح رواں ہے۔ صابر آفاقی کے ہاں تشبیہات واستعارات کا برمحل استعمال بھی ان کے کلام کا خاصا ہے۔ وہ اپنے ماضی الضمیر کا اظہار اپنے بھرپور الفاظ میں بھرپور جذبے کے ساتھ کرتے ہیں۔ جذبوں کی شدت ان کے کلام کی ایک نمایاں صفت ہے۔ صابر آفاقی کا کلام آنائیت کا حامل ہے احسان دانش کے الفاظ ہیں۔

> ''صابر آفاقی کی شاعری میں کشمیر کے چشموں میں نہائے نغمے بھی ہیں، سفید احرام

باندھے ہوئے کوہساروں کی سنجیدگی بھی اور سیاہ برقع پوش راتوں کی متانت بھی۔انھوں نے کندنی صبحوں کی زر پاش کرنوں کی جھنکاریں بھی اشعار میں سمودی ہیں جو اہل نظر کے لیے ایک خاموش تماشے سے کم نہیں''۔۳

سیدہ آمنہ بہار کی شاعری آزاد کشمیر کے علاوہ پاکستان میں بھی مقبولیت رکھتی ہے۔آمنہ بہار غزل کی شاعر ہیں۔ غزل ان کے لیے ہے اور وہ غزل کے لیے۔سیدہ آمنہ بہار کے کلام میں بھی کشمیر کے ذرے ذرے کا پرتو ملتا ہے وہ اپنے وطن سے محبت کرنے والی شخصیت ہیں۔ان کے کلام میں وطن کی محبت کے علاوہ مذہب بھی دکھائی دیتا ہے۔سیدہ آمنہ بہار کے ہاں فکری سطح اور فنی لوازم دونوں کی پختگی موجود ہے۔سیدہ آمنہ بہار کے کلام میں عشق ومحبت کے مضامین بھی ہیں اور ہجر و وصال کی کیفیات بھی۔سیدہ آمنہ بہار کی غزل میں اشعار کی گیرائی اور گہرائی دونوں موجود ہیں۔وہ قلم وقرطاس سے اپنے رشتے کو یوں بھی نبھار ہیں ہیں کہ یہ بات ان کی گھٹی میں پڑی ہے۔ان کے والد اور دیگر بہن بھائی بھی ادبی دنیا میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

سیدہ بہار کبھی بھی اپنے قاری کو بوجھل نہیں ہونے دیتیں۔ان کے کلام میں حلاوٹ بھی ہے اور لفظوں کی چاشنی بھی۔ان کا ہر شعر معنویت سے بھرپور ہے جس پر مقصدیت بھی نمایاں ہے۔آمنہ بہار کا شعور بیدار اور احساس شدت آشنا ہے۔وہ اپنے جذبات کو جب لفظوں کا روپ دیتی ہیں تو اس میں اس قدر احتیاط سے کام لیتی ہیں کہ لفظی حرمت مجروح نہ ہونے پائے۔سیدہ آمنہ بہار کے ہاں جدت کے تمام دروا ہوتے ہیں لیکن وہ کلاسیکیت سے بھی نظر نہیں چراتیں ان کی غزل میں پھولوں کی مہک اور ہوا کے جھونکے قاری کو فرحت بخشتے ہیں۔

ڈاکٹر افتخار مغل آزاد کشمیر کی ادبی تاریخ میں ایک بڑا نام ہے۔وہ ایک شاعر ہونے کے علاوہ کالم نگار، نثر نگار، محقق، نقاد اور صحافی کے طور پر بھی اپنی شناخت رکھتے ہیں افتخار مغل نے بھرپور ادبی زندگی گزاری اور ۲۰۱۱ء میں عین اسی روز خالق حقیقی سے جا ملے جس دن صابر آفاقی لقمہ اجل بنے۔افتخار مغل کے ساتھ بھی غزل نے وفا کی۔وہ میؔر کے معتقد تھے۔میر تقی میر ہی افتخار مغل کے روحانی استاد ہو سکتے ہیں۔افتخار مغل کے کلام میں میر کا بار بار ذکر اس بات کا پتا دیتا ہے کہ افتخار مغل کو میر سے کس قدر عقیدت تھی۔افتخار مغل نے وطن سے جو محبت کی اس کا ثبوت ۱۹۹۳ء میں ''لہولہو کشمیر'' کی اشاعت کی صورت میں دیا۔افتخار مغل کے کلام میں کشمیر بنیادی موضوع ہے وہ اپنے وطن کا نوحہ بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس بات پر بھی اُمید

رکھتے ہیں کہ ضرور وہ دِن آئے گا جب کشمیر دستِ غیر سے آزاد ہوگا۔افتخار مغل کی غزل عہد جدید کی غزل ہے لیکن اس میں عہد عتیق کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔

افتخار مغل کے ہاں فکری سطح پر جب غزل کا مطالعہ کریں تو ان کی فکر میں کشمیر کے علاوہ محبت اور معاشرت اہم موضوعات ہیں۔افتخار مغل کے ہاں مذہبی عناصر کم ہیں تاہم جو ہیں وہ بھی اس بات پر سوچنے پر مجبور کرتے ہیں کہ افتخار مغل کو مذہب سے کتنی عقیدت تھی وہ محمد صل اللہ علیہ وآلہ وسلم سے والہانہ محبت رکھتے تھے۔افتخار مغل کی شاعری میں انا پرستی بھی ہے اور قنوطیت بھی۔افتخار مغل اپنی انا میں اس قدر جھکڑے ہوئے تھے کہ کسی کو برداشت کرنا، کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرنا ان کے لیے ڈوب مرنے کا مترادف تھا۔وہ اپنی انا پرستی کے اس قدر اسیر تھے کہ ان کا کلام انا پرستی سے بھر پور نظر آتا ہے۔ افتخار مغل کے فن میں بھی ان کا ثانی نہیں ملتا۔آزاد کشمیر کے جتنے بھی شعرا گزرے ہیں ان میں شاید کسی اور کے ہاں اتنی وسعت ہو جتنی افتخار مغل کے ہاں موجود ہو۔افتخار مغل نے جہاں محبت کے مضامین کو نبھایا وہیں ان کے ہاں شوخی بھی موجود ہے۔انھوں نے مزاح کا انداز اپنانے سے گریز کیا تاہم شوخی اور شرارت ان کے کلام میں ضرور ملتی ہے۔افتخار مگل دوستوں کا افتخار تھے۔ان کے کلام میں بھی دوستوں کا ذکر موجود ہے۔احمد ندیم قاسمی، ایم یامین اور منصورہ احمد وغیرہ کے لیے نظمیں لکھنے والے افتخار مغل نے غزل میں بھی اپنے دوستوں کو یاد رکھا۔

واحد اعجاز میر کا تعلق آزاد کشمیر کے ان شعرا سے ہے جھنوں نے کم وقت میں زیادہ نام کمایا۔واحد اعجاز میر نے ایم اے انگریزی کرنے کے باوجود اردو غزل کو اپنا ذریعہ اظہار بنایا۔واحد اعجاز میر کی غزل میں ایک نیا پن ملتا ہے۔انھوں نے اپنی غزل کی شناخت کو کہیں بھی مجروح نہیں ہونے دیا۔ان کی غزل میں معاشرے کی خوب صورت عکاسی اور وطن سے محبت کا خوب صورت بیان ملتا ہے۔واحد اعجاز بھی محبت کے شاعر ہیں۔ان کی غزل بھر پور عشقیہ جذبات کی حامل ہے۔وہ اپنے جذبات کو کبھی بھی چھپا کر نہیں رکھتے بلکہ الفاظ کی صورت میں بیان کر دیتے ہیں۔واحد اعجاز میر کے کلام میں کربلا کے مناظر بھی ہیں، عشق کے مختلف انداز بھی، کشمیر کے نظارے بھی اور ان کے اپنے حالات بھی۔وہ نیلم و جہلم کے بہتے پانی کی طرح لفظوں کو بھی رواں کرتے ہیں۔واحد اعجاز میر کے کلام میں انگریزی کے الفاظ کا استعمال بھی ان کے اسلوب کی پہچان ہے۔

ب) نتائج:

زیرِ تحقیق مقالے میں آزاد کشمیر کے چھے شعرا انتخاب کیا گیا ہے۔ اس مقالے میں ان شعرا کے ہاں غزل کے اندفکر اور فن کے علاوہ اسلوب کے حوالے سے جاننے کی کوشش کی گئی ہے۔ ۱۹۷۰ء سے ۲۰۱۶ء تک کے شعرا میں سے چھے شاعروں کو منتخب کرنے کے بعد دوحصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ ان شعرا کے ہاں غزلیات کو دورانِ تحقیق جانچنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دوران تحقیق جو بات شدت سے محسوس کی گئی وہ یہ تھی کہ آزاد کشمیر کے ان شعرا کے ہاں کشمیر بنیادی موضوع ہے۔ اس کے علاوہ یہاں کے چشموں، دریاؤں اور کہساروں کی بات بھی ان شعرا کے ہاں اہمیت رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ ان شعرا نے عشق و محبت جو اردو غزل کا بنیادی موضوع ہے کو بھی خوب نبھایا ہے۔

ان منتخب شعرا کے ہاں مذہب اور معاشرت کے حوالے سے بھی بھرپور خامہ فرسائی کی گئی ہے۔ ان کے ہاں ترقی پسند سوچ بھی کارفرما دکھائی دیتی ہے۔ کسی ان شعرا کے ہاں کچھ باتیں ایک دوسرے کے منافی بھی ملتی ہیں۔ افتخار مغل کے ہاں انا پرستی کا عنصر زیادہ موجود ہے تو صابر آفاقی کے ہاں امن و محبت کے علاوہ مزاح کا عنصر ملتا ہے۔ الطاف قریشی گاؤں سے متاثر ہیں تو زاہد کلیم کے ہاں فلسفیانہ سوچ موجود ہے آمنہ بہار کے ہاں مذہب کے پہلو نمایاں ہیں تو واحد اعجاز میر کے ہاں عشق و محبت کے اثرات عیاں ہیں۔

دوران تحقیق اس بات کو بھی محسوس کیا گیا کہ آزاد کشمیر کے دور دراز علاقوں میں ہونے کے باوجود ان شعرا کے ہاں جدت شعری رموز سے آشنائی دنیا میں رونما ہونے والے تمام واقعات پر پوری پوری نظر ہے۔ دنیا کے کسی بھی کونے میں ناانصافی ہو رہی ہو یا کہیں بھی کوئی اہم واقعہ رونما ہوا ہو شعرائے کشمیر نے اس سے متاثر ہو کر اس پر قلم ضرور اٹھایا ہے۔ ان شعرا نے انسانیت کے حق میں آواز بلند کرتے ہوئے ہر جگہ ظلم کی جبر کی اور جنگ و جدل کی بھرپور خدمت کی ہے۔

ج) سفارشات:

ادیب چوں کہ معاشرے کا سب سے حساس طبقہ ہوتا ہے۔ اس لیے وہ لوگوں کے دکھ درد اور غم کو بہتر طور پر سمجھ سکتا ہے۔ کوئی بھی ادب پرور چاہے وہ شاعر ہو یا نثر نگار اپنے مخصوص انداز میں معاشرتی بے راہ رویوں اور ناہمواریوں کو الفاظ کے ذریعے بیان کر دیتا ہے۔ وہ اس کام کو کرنے میں کسی قسم کی لالچ یا حرص نہیں رکھتا۔ اس کے قلم کا کام ہی متحرک رہنا ہے سو

شاعر اپنے قلم کو بنا کسی لالچ کے کام میں لاتا ہے۔

آزاد کشمیر کے منتخب غزل گو شعرا کے ہاں بھی یہی بات دیکھی گئی ہے کہ انھوں نے اپنے قلم کے ساتھ انصاف کیا ہے اور اس سے خاطر خواہ کام لیا ہے۔اس مقالے کے بعد جو سفارشات مرتب کی جا رہی ہیں وہ دوران تحقیق محسوس کی گئی ہیں۔دورانِ تحقیق یہ بات محسوس کی گئی کہ آزاد کشمیر کے شعرا کا ایک تذکرہ لکھا جائے کیوں کہ آزاد کشمیر کے شعرا کی تعداد اچھی خاصی ہے اور ان پر ایک مکمل اور بھرپور تذکرہ مرتب کیا جا سکتا ہے۔آزاد کشمیر کے شعرا کے مابین تقابلی جائزہ بھی کیا جانا چاہیے۔آزاد کشمیر کے شعرا کی نظم نگاری کے حوالے سے بھی تحقیقی و تقابلی جائزہ لیا جانا چاہیے۔آزاد کشمیر میں اردو نثر نگاری پر بھی تحقیق ہونی چاہیے۔

حوالہ جات

۱۔ عبدالکریم، پروفیسر،محمد خان نشتر سے زاہد کلیم تک (مشمولہ)، روزنامہ سیاست،مظفر آباد،۱۱، دسمبر۲۰۱۲ء۔

۲۔ محمد سعید،حکیم،غزل (دیباچہ)، سارے جہاں کا درد، صابر آفاقی، ادبیات،مظفر آباد،۲۰۰۰ء،ص ا

۳۔ احسان دانش (پیش لفظ)،شہرتمنا، صابر آفاقی، آئینہ ادب، لاہور،۱۹۸۰ء،ص۹۔

کتابیات

بنیادی مآخذ

الطاف قریشی، شہرزندگی، نیلم پبلی کیشنز، مظفرآباد، ۱۹۹۵ء۔

الطاف قریشی، ثنا، نقیب پبلی کیشنز، مظفرآباد، ۱۹۸۳ء۔

زاہد کلیم، نغمہ تارحیات، انٹرنیشنل پریس، کراچی، ۱۹۸۰ء۔

زاہد کلیم، محراب فکر، نیلم پبلی کیشنز، مظفرآباد، ۲۰۰۶ء۔

صابر آفاقی، شہرتمنا، ادبیات پبلی کیشنز، مظفرآباد، ۱۹۸۰ء۔

صابر آفاقی، خندہ ہائے بہ جا، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۴ء۔

صابر آفاقی، سارے جہاں کا درد، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۰ء۔

سیدہ آمنہ بہار، چناروں کی آگ، علی پرنٹرز، راولپنڈی، ۱۹۸۹ء۔

افتخار مغل، لہولہو کشمیر، اُجالا پبلی کیشنز، مظفرآباد، ۱۹۹۱ء۔

افتخار مغل، انکشاف، اساطیر، پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء۔

واحد اعجاز میر، راستہ مت بدل، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء۔

واحد اِعجاز میر، آواگون، رومیل پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۱۵ء۔

ثانوی ماخذ

احمد وقار (مرتبہ)، کہکشاں، نکس پبلی کیشنز، میرپور، ۲۰۱۴ء۔

اِعجاز نعمانی، (مرتبہ)، اس گلی میں ہے بیل پھولوں کی، الرزاق پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵ء۔

انیس ناجی، شعری لسانیات، فیروزسنز، لاہور، ۱۹۹۰ء۔

الطاف حسین حالی، مقدمہ شعروشاعری، عبداللہ اکیڈمی، لاہور، ۲۰۰۹ء۔

احمد عطاء اللہ، ہمیشہ، العصر پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء۔

الطاف عاطف،جھیل کا چاند،مہلب پبلی کیشنز ہاؤس،کوئٹہ،۲۰۱۴ء۔

اکرم سہیل، نئے اُجالے ہیں خواب میرے، جمہوری پبلی کیشنز، لاہور،۲۰۱۶ء۔

احسن سلیمان، مجھے تم سوچ کر دیکھو،حویلی پبلشنگ ہاؤس،کہوٹہ،۲۰۱۶ء۔

انور جمال، پروفیسر،ادبی اصطلاحات،نیشنل بک فاؤنڈیشن،اسلام آباد،۲۰۱۵۔

پریم ناتھ بزاز، پنڈت، تاریخ جدوجہد آزادی کشمیر،عبدالحمید نظامی (مترجم)،ویری ناگ پبلشرز، میر پور۱۹۹۶ء۔

جواد جعفری،احتجاج،تحقیقات سلائی،مظفرآباد، جون۱۹۹۴ء۔

حامد حسن قادری،تاریخ وتنقید،لکشمی نارائن اگروال، پبلشرز، آگرہ،طبع دوم ۱۹۴۷ء

حبیب کیفوی، کشمیر میں اُردو،اُردو سائنس بورڈ، لاہور،۱۹۶۹ء۔

زکریا شاز، خاموشی کی کھڑکی سے،زیون مطبوعات،فیصل آباد،۲۰۱۳ء۔

سردار جعفری،ترقی پسند ادب،مکتبہ پاکستان، لاہور،۱۹۵۶ء۔

سلیم اختر، ڈاکٹر،تنقیدی اصطلاحات،سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور،۲۰۱۱ء۔

شہباز گردیزی،خواب کون دیکھے گا،طلوع پبلی کیشنز، باغ،۲۰۰۸ء۔

شہباز گردیزی،اجلی مٹی (انتخاب)،نکس پبلشرز، میر پور، مارچ ۲۰۱۵ء۔

شفیق راجا، میں حرف حرف سمیٹوں،طلوع ادب پبلی کیشنز، باغ،ستمبر۲۰۰۳ء۔

صدیقی ابوالاعجاز، کشاف تنقیدی اصطلاحات،اسلوب،اسلام آباد،۲۰۰۹ء۔

عابد علی عابد،اسلوب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور،۲۰۱۲ء۔

عشرت رومانی،فکروفن کے نئے زاویے اور شاعری کا سفر، رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی،۲۰۱۲ء۔

فرزانہ ناز، پروفیسر، کشمیر اُردو ادب اور طنز ومزاح،ادارہ نکس، میر پور،۲۰۱۶ء۔

گوپی چند نارنگ،سانحہ کربلا بطور شعری استعارہ،سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور،۱۹۹۱ء۔

مخلص واجدانی،صلیبوں کا شہر،ادبیات،مظفرآباد،س ن۔

مسرت صبوحی، پروفیسر، کشمیر میں مزاحمتی ادب،علی پرنٹرز، میر پور،۲۰۱۴ء۔

محمد ہادی حسین، مغربی شعریات، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۱۰ء۔

محمد حسین آزاد، نظم آزاد، مفید عام پریس، لاہور، ۱۹۸۹ء۔

محمد صغیر آسی، شعرائے کشمیر، الفضل کتاب گھر، میر پور، ۱۹۹۳ء۔

محمد خان نشتر، لمحات نشتر، نیلم پبلی کیشنز، مظفر آباد، نومبر ۲۰۰۲ء۔

محمود شیرانی، حافظ، مقالات محمود شیرانی، مظہر محمود شیرانی (مرتبہ)، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۹ء۔

منظور ہاشمی، ساز دل صدا، نیلم پبلی کیشنز، مظفر آباد، ۲۰۱۴ء۔

ناز مظفر آبادی، ہم سخن، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۵ء۔

نذیر انجم، قرض سخن، ارشد بک سیلرز، میر پور، س ن۔

یوسف حسین خان، ڈاکٹر، اُردو غزل، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، علی گڑھ، ۲۰۱۰ء۔

یوسفی، مشتاق احمد، چراغ تلے، مکتبہ دانیال، کراچی، ۱۹۶۶ء۔

رسائل واخبارات

اوراق، لاہور، ۱۹۶۷ء۔

دومیل (علمی وادبی مجلّہ)، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج مظفر آباد، اپریل ۲۰۱۲ء۔

روزنامہ دُنیا، لاہور، ۲۱ ستمبر ۲۰۱۶ء۔

روزنامہ دُنیا، لاہور، ۲۱ جنوری ۲۰۱۷ء۔

روزنامہ نوائے وقت، راولپنڈی، ۱۹ اکتوبر ۱۹۸۹ء۔

فنون، لاہور، جون تا دسمبر ۱۹۹۷ء۔

روزنامہ نوائے وقت، راولپنڈی ۳ جولائی ۱۹۸۰ء۔

فنون، لاہور، اپریل تا اگست ۲۰۰۲ء۔

فنون، لاہور، جون تا دسمبر ۱۹۹۷ء۔

روزنامہ سیاست، مظفرآباد، ۳۱ جولائی، ۲۰۱۷ء۔

روزنامہ جناح، اسلام آباد، ۱۹ جنوری ۲۰۱۷ء۔

انٹرویوز اور خطوط

راقم کا شوکت اقبال سے انٹرویو بتاریخ ۱۷ جون ۲۰۱۷ء، بمقام مظفرآباد۔

راقم کا واحد اعجاز میر سے انٹرویو، بتاریخ ۲۷ جولائی، ۲۰۱۷ء، بمقام مظفرآباد۔

راقم کا رانا غلام سرور سے انٹرویو، بذریعہ ٹیلی فون، ۲۱، نومبر، ۲۰۱۶ء۔

راقم کا آمنہ بہار سے انٹرویو بتاریخ ۲۳ اپریل ۲۰۱۷ء، بمقام مظفرآباد۔

راقم کا زاہد کلیم سے انٹرویو بتاریخ ۲۸ دسمبر ۲۰۱۶ء، بمقام مظفرآباد۔

راقم کا ڈاکٹر گوہر نوشاہی سے انٹرویو بتاریخ ۲۸ دسمبر ۸۲۰۱۵ء، بمقام بارہ کہو اسلام آباد۔

راقم کا احمد عطاء اللہ سے انٹرویو بتاریخ ۳۰ جولائی ۲۰۱۴ء، بمقام مظفرآباد۔

راقم کا ڈاکٹر ماجد محمود سے انٹرویو بتاریخ ۱۳ ستمبر ۲۰۱۵ء، بمقام راولاکوٹ۔

احمد ندیم قاسمی کا خط بنام واحد اعجاز میر ۲۵ مئی ۲۰۰۲ء۔

ظہور منہاس کا خط، بنام مقالہ نگار، ۲۱، جنوری ۲۰۱۷ء۔

ڈاکٹر ماجد محمود کا خط، بنام مقالہ نگار، ۱۳، جنوری ۲۰۱۷ء۔

شوزیب کاشر کا خط، بنام مقالہ نگار، ۲۳، ۱ کتوبر ۲۰۱۷ء۔

جاوید سحر کا خط، بنام مقالہ نگار، ۳ جولائی ۲۰۱۷ء۔

لغات/فرہنگ

عبدالحفیظ بلیاوی، ابولفضل، مولانا، مصباح اللغات، ادارۃ العلم، نوشہر، جون ۲۰۱۴ء

وارث سرہندی (مرتبہ)، علمی اردو لغت، علمی کتب خانہ، لاہور، س ن